منشور

حبیب جالب

نشیمنوں کو جلا کر کیا چراغاں خوب
سنوارتے ہیں یونہی چہرۂ گلستاں خوب

لہو اچھال کے اہلِ وفا کا راہوں میں!
قدم قدم پہ کیا پاسِ دلفگاراں خوب

کِھلا کے شاخِ دل و جاں پہ پھول زخموں کے
مسرّتوں کو کیا آپ نے نمایاں خوب!

مچی ہے چاروں طرف آپکے کرم کی دھوم
نبھائے آپ نے اُلفت کے عہد و پیماں خوب

ہر ایک بجھتا ہوا دیپ کہہ رہا ہے یہی،
تمام رات رہا جشنِ نو بہاراں خوب

مزدوروں کے بین الاقوامی دن کے موقعہ پر

ماهنامہ **منشور** کراچی

یکم مئی ۱۹۶۵ء کو

یومِ مئی نمبر

پیش کرے گا

مزدور دوست اور قلم کار حضرات اس تاریخی واقعے سے متعلق اپنی تخلیقات جلد از جلد روانہ فرمائیں

منشور کا یوم مئی نمبر محنت کشوں کی تنظیم اور انکی بے مثال جدوجہد کی ایک تاریخی دستاویز ہوگا۔

ماہنامہ منشور۔ کراچی ایئرپورٹ فون :- ۴۹۱۶۹

ماہنامہ

ارژنگ

پشاور

★ ارژنگ کا ہر شمارہ اردو ادب میں ایک اضافہ کا سبب بنتا ہے

★ ارژنگ کو اردو کے مشہور فنکاروں کے ساتھ ساتھ نئے اذہان اور جدید فکر و احساس کے نمائندہ قلم کاروں کا تعاون بھی حاصل ہے۔

★ ارژنگ اردو زبان و ادب کے ساتھ پشتو ادب اور کلچر کی نمائندگی کا فرض بھی ادا کرتا ہے۔

ارژنگ

کے چند لکھنے والے

فیض احمد فیض ، راجندر سنگھ بیدی ، فارغ بخاری ، مظفر علی سید ، رضیہ فصیح احمد ، شفقت تنویر میرزا ، آغا سہیل ، ادیب سہیل ، عبدالعزیز خالد ، صلاح الدین محمد ، مظفر حنفی ، فتح محمد ملک ، شیر افضل جعفری ، اریاحق احمد ظفر ، جمیل ملک ، افضل منہاس اور دوسرے

خوبصورت گٹ اپ - صفحات ۱۰۰ - قیمت ایک روپیہ

ماہنامہ **ارژنگ** ۳۰- عنایت منزل سکندر ٹاؤن پشاور

ہربنس دوست

کی دنیا تھیٹر اور فلم کی دنیا ہے۔

★ وہ چونکہ خود ایک اچھا اداکار ہے ، ہدایت کار ہے اس لئے وہ فنِ ڈرامہ ڈراما کے اسرار و رموز سے پوری طرح واقف ہے۔

★ اس نے کڑی سے کڑی آزمائش کے وقت بھی ڈرامے اور اسٹیج کے دامن کو نہیں چھوڑا۔

★ اس کی اس کڑی ریاضت کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ اس کے ڈرامے ہندوستان کے ہر صاحب ذوق سے داد پا چکے ہیں۔

ہربنس دوست کا نیا شاہکار

جب لوہا پگھلتا ہے

تین ایکٹ کا یہ ڈرامہ مزدوروں کے نئے رخ سامنے لاتا ہے

قیمت :- ایک روپے پچاس پیسے - خوبصورت گٹ اپ

مکتبۂ ارژنگ پشاور

۳۰- عنایت منزل سکندر ٹاؤن

حیات و کائنات کا ترجمان

منشور

جلد - ۲ فروری ۱۹۶۵ء شمارہ - ۲

مدیر

سبطِ اختر

قیمت فی پرچہ

پچیس پیسے

سال بھر کے لئے

تین روپے

ناشر

سبط اختر

مطبع

سپر آرٹ پریس فریر روڈ کراچی

پتہ

ماہنامہ منشور - ایئرویز ایمپلائز یونین

پی آئی اے برانچ - کراچی ایئرپورٹ

فون نمبر ۴۹۱۶۹

اِس منشور میں

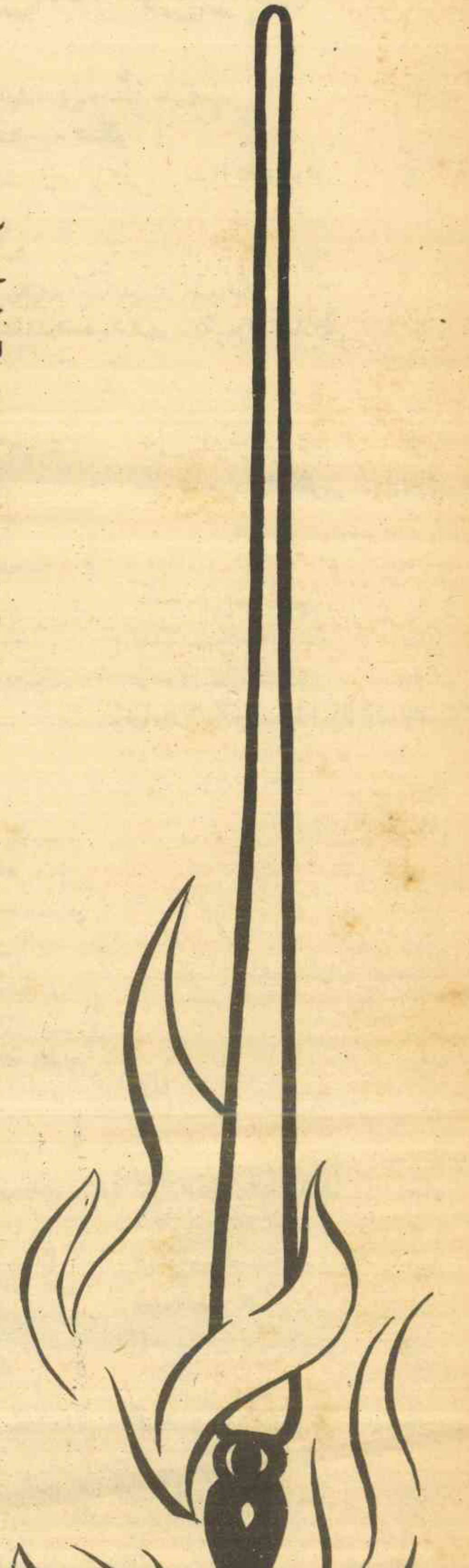
گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

سنہ ۱۹۶۵ء کو ہم سب نے نہ جانے کتنی نیک تمناؤں اور تعمیری ارادوں کے ساتھ خوش آمدید کہا تھا مگر وائے قسمت کہ آج ہم ایک کرب و اضطراب میں مبتلا ہیں۔ ہاں ہماری چشم گنہگار نے کراچی کی بعض غریب بستیوں میں جنوری کے پہلے ہفتے میں آگ اور خون کا ایک بہیمانہ کھیل دیکھا۔ ایک جشن تھا جسمیں عوام کے لہو کے چراغ جلائے گئے جشن ——— جسمیں "جھگی نشین" "قارئوں" کے "خزانے" لوٹے گئے۔ جشن ——— جسمیں بھولے بھالے انسان، نفرت، تعصب اور صوبائیت کے زہر آلود تیروں کا نشانہ بنائے گئے۔ غرض ہر طرف ——— آگ ـــ شیطانی آگ بھڑکتی رہی۔ ہر سمت ——— خون ——— انسانی خون بہتا رہا۔ !

شیطان تو خیر یہ خونی ناٹک رچا کر اپنے عشرت کدوں اور اپنی کمین گاہوں کی طرف لوٹ گئے لیکن ——— آدم کے فرزند ——— ہم اور آپ کتنے بے حس اور بے شعور ہیں کہ ایک دوسرے کو ہی شک و شبہ کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ "فلانے" اور "ڈھمکانے" کے نام سے پکار رہے ہیں۔ گویا کہ اب ہم انسان نہیں رہے۔ پاکستانی نہیں رہے۔ یا شاید۔ ہم اب بس کسی ایک مخصوص رنگ و نسل میں سمٹ کر اور صرف کسی ایک صوبے سے ہی منتھی ہو کر رہ گئے ہیں اور اب ہم میر و غالب کو نہ پڑھیں گے۔ خوشحال خاں خٹک اور رحمٰن بابا کو بھول جائیں گے۔ نذر الاسلام اور زین العابدین سے ہمارا کوئی واسطہ نہ رہے گا۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی، بابا فرید، وارث شاہ، شیخ ایاز اور گل خان نصیر سے اب ہمارا کوئی ذہنی تعلق اور رشتہ نہ رہے گا۔ تف ہے ہم پر کہ ہم نے یہ منفی نقطۂ نظر اپنا لیا۔ لعنت ہے ہم پر کہ ہم نے یہ گھناؤنا طرزِ عمل اختیار کر لیا۔

آج ——— اس مقدس سرزمین سے محبت کرنے والے تمام انسانوں کی گردنیں شرم سے جھک جانی چاہئیں۔ شرم اس بات پر کہ سب سے بڑی "اسلامی مملکت" میں "مثالی اخوت" کی بنیادیں متزلزل کر دی گئیں۔ ندامت اس پر کہ عوام جنھیں ظلم و بربریت، استحصال و استبداد کے خلاف صف آرا ہونا چاہئیے تھا۔ وہ خود ہی باہم دست و گریباں ہو گئے اور ہوا یہ ہی کہ گھر لٹے تو محنت کرنے والوں کے، خون بہا تو غریب لوگوں کا، سہارے چھنے تو نادار ضعیفوں کے، سہاگ اجڑا تو مفلس بہنوں کا اور پھر سب سے بڑا المیہ تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ بدست خود کرنے والے اشخاص کو بھی تو کچھ نہیں ملا۔ مگر ہاں کھنکھناتے ہوئے چند سکے جو صرف کچھ ہی روز ان کے شکم و دہن کا رشتہ قائم رکھ سکے ہوں گے۔ ٹھرے کی چند بوتلیں ـــ جنھوں نے محض کچھ لمحوں کے لئے ہی انھیں افکار و مصائب کی اس دوزخ سے نجات دلائی ہوگی۔ لچر اور بیہودہ فلموں کے چند ٹکٹ جن کے سہارے انھوں نے کچھ گھنٹوں تک سماجی تقاضوں اور عوامی مسائل سے فرار حاصل کر لیا ہوگا۔ بیسواؤں اور داشتاؤں کے بدمکروہ بوسے، جن سے ان کی عارضی تسکین ہو گئی ہوگی۔ بس اس کے علاوہ تو اور کچھ نہ ملا ہوگا ان بدبختوں کو۔ اندھیرا تو اب بھی ان کے گھروندوں میں ہوگا۔ جیبیں تو خالی ان کی اب بھی ہونگی۔ بچے تو علم و دانش کے نور سے محروم ان کے اب بھی ہونگے۔ لہٰذا قابلِ نفرت اور قصوروار یہ لوگ نہیں ہیں بلکہ اصل مجرم اور پاپی تو وہ ہیں جو پردے کے پیچھے ہوتے ہیں۔ نظروں سے اوجھل ہیں۔ ہم نے ابھی تک ان کو نہیں پہچانا۔ اس لئے اب تک یہ سب کچھ ہوتا رہا ہے اور اس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک سامراج اور اس کا پروردہ جاگیردارانہ و سرمایہ دارانہ نظام ہم پر مسلط ہے۔ جب تک، لچی، بے ضمیر، اقتدار پرست لیڈر آسمان سے نازل ہوتے رہیں گے جن کو نہ تو عوام سے کوئی واسطہ ہے نہ ان کے دکھ درد سے کسی قسم کی ہمدردی۔ مہاجر اور پٹھان نہ کبھی اس طرح لڑتے ہیں اور نہ شیعہ اور سنی اور نہ ہی اردو یا بنگالی بولنے والوں میں ایسے جھگڑے ہوتے ہیں اصل حقیقت ہے تو صرف اتنی کہ ان کو گندم نما جو فروش اپنے گندے مقاصد حاصل کرنے کے لئے لڑاتے رہتے ہیں بنیادی بات ہے تو صرف یہ کہ مکر کی چالوں سے انتہائے سادگی مات کھا جاتی ہے۔

یہاں، ہمیں انتظامیہ کے نمائندوں سے بھی یہ کہنا ہے کہ وہ پوری سنجیدگی سے، خود تعصب و جانبداری سے بالاتر ہو کر اور پوری فرض شناسی کے ساتھ اس صورتِ حال سے نبٹیں عدالتی تحقیقات کے عوامی مطالبے کو شرپسندوں کی چال یا دیوانوں کی بڑ سمجھ کر نظرانداز کرنے کی حماقت نہ کریں اور اس بات کی ٹھوس ضمانت دیں کہ مستقبل میں ان شرمناک واقعات کا اعادہ نہیں ہوگا۔ اگر یہ ممکن نہیں تو پھر یہ بھی ناممکن نہیں کہ آگ اور خون کا یہ کھیل جھونپڑوں سے بڑھ کر ان محفوظ محلوں تک پہنچ جائے جن سے اب تک صرف اس کھیل کا نظارہ کیا جاتا رہا ہے۔ عوام لاکھ بھولے سہی لیکن اتنے بھولے بھی نہیں کہ زیادہ عرصے



صحرا بہ صحرا
کو بہ کو

اقوامِ متحدہ ـــــ ایک نیا موڑ

سیاہ براعظم کا ایک روشن ستارہ کیوسن سیکی اقوام متحدہ کی ۱۹ انیسویں جنرل اسمبلی کا صدر منتخب ہوا۔



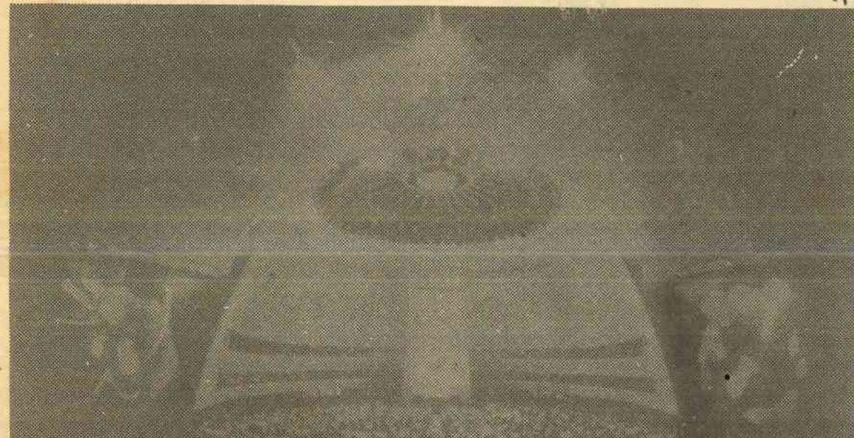
سیاہ براعظم کا روشن ستارہ
کیوس سیکی

گھانا جیسے ترقی پسند اور قوم پرست ملک کے نمائندے کا جنرل اسمبلی کا صدر منتخب ہونا، اقوام متحدہ میں افریشیائی اقوام کی عددی برتری کا ہی اظہار نہیں بلکہ یہ اس بات کا بھی مظہر ہے کہ افریشیائی ممالک موجودہ دور میں اپنے تاریخی مشن کی تکمیل ہر قیمت پر کریں گی جسکا مقصد افروایشیائی اقوام میں حقیقی اتحاد پیدا کرنا ـــ اور اس سرزمین کو غیر ملکی لٹیروں سے پاک کرنا ہے۔

۱۹ ویں جنرل اسمبلی کا آغاز انتہائی غیر معمولی حالات میں ہوا تھا۔ کیونکہ امریکہ اس بات پر زور دے رہا تھا کہ روس اپنے واجبات کو ادا کرے ورنہ آرٹیکل ۱۹ کے تحت ووٹ کے حق سے محروم کر دیا جائے۔ روس کا ووٹ کے حق سے محروم ہونا کوئی اتنی معمولی بات نہیں تھی اس لئے یہ خیال تھا کہ جنرل اسمبلی تعطل کی نذر ہو جائے گی۔

روس پر واجبات کی کہانی بھی دلچسپ ہے اقوام متحدہ نے کانگو میں جو فوجی کاروائی کی اس پر کافی رقم خرچ ہوئی تھی اور واضح رہے کہ یہ فوجی کاروائی امریکہ کے اشارے پر ہوئی تھی حالانکہ روس نے اسکی شدومد سے مخالفت کی تھی کیونکہ روس کے نقطۂ نظر کے مطابق یہ کانگو کے داخلی معاملات میں مداخلت تھی اور حقیقت بھی یہی تھی کہ اقوام متحدہ کی فوج نے نہ کہ صرف عظیم لوممبا کی حکومت کو معطل کر کے رکھ دیا بلکہ اسی کی موجودگی میں امریکی اشارے پر کاساؤبو نے ایک نام نہاد انقلاب کے ذریعہ کانگو کی جائز قوم پرست حکومت کا تختہ الٹ دیا اور اقوام متحدہ کی افواج کی موجودگی میں کانگو کا عظیم فرزند لوممبا شہید کر دیا گیا ـــ یہ تھیں وہ کارگذاریاں جو اقوام متحدہ کی فوج نے کانگو میں انجام دیں گویا کہ سامراجی مقاصد کی تکمیل کے لئے اقوام متحدہ کی افواج کو آلۂ کار بنایا گیا ـــ اور اس نام نہاد امن و امان قائم کرنے کے مشن پر امریکہ چاہتا ہے کہ اسکی طرح روس بھی ہاتھ بٹائے روس کی حکومت نے واضح الفاظ میں اس سامراجی مشن میں کسی طرح اپنے ہاتھ ملوث کرنے سے انکار کر دیا۔

اس تعطل اور غیر یقینی حالت کو دور کرنے کے لئے امریکہ اور روس کے وزرائے خارجہ کے درمیان طویل



اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا ایک منظر

گفت وشنید ہوئی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکل سکا۔ روس کا اصرار تھا کہ وہ فوجی کارروائیوں کی مد میں کوئی بھی رقم دینے پر تیار نہیں ہے۔ جبکہ امریکہ کی ضد تھی کہ روس خاص اسی مد میں رقم ادا کرے — آخرکار اس بات پر کسی حد تک مصالحت ہوگئی کہ روس اقوام متحدہ کے مالی بحران کے پیش نظر رقوم ادا کرے گا جس کو کسی مد میں نہیں دکھایا جائے گا نیز ان دو بڑی طاقتوں نے پس پردہ یہ بھی طے کر لیا کہ فوجی کارروائیوں کیلئے سلامتی کونسل سے اجازت لیجائیگی۔ واضح رہے کہ سلامتی کونسل میں روس اور امریکہ دونوں کو ویٹو کا حق حاصل ہے۔

امریکہ اور اس کے حواریوں نے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت یہ بحران پیدا کیا تھا۔ کیونکہ اس طرح روس سمیت کم و بیش ۱۸ ممالک متاثر ہو رہے ہیں اور امریکہ سمجھتا ہے کہ اس طرح وہ اس سال بھی چین کو اقوام متحدہ میں داخل ہونے سے روک سکے گا — امریکہ یہ دیکھ رہا ہے کہ وہی اقوام متحدہ جو کبھی اس کے چشم و ابرو کے اشارے پر سب کچھ کرنے پر تیار ہو جاتی تھی — وہی اقوام متحدہ جس نے کوریا میں جارحانہ کارروائیوں کا جواز ہی نہیں پیدا کیا تھا بلکہ ہر ممکن تعاون کیا تھا اب اس پر سے آہستہ آہستہ امریکی اثر کم ہوتا جا رہا ہے — اور امریکہ کے لئے یہ مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو گیا ہے کہ وہ چین کے داخلے کو روک سکے کیونکہ افریشیائی ممالک ہی نہیں بلکہ فرانس جیسے فوجی اور سیاسی حلیف بھی امریکہ کی اس غیر منطقی اور دیوالیہ پالیسی کا ساتھ دینے پر تیار نہیں ہیں۔

اس صورت حال سے نبٹنا آسان نہیں تھا لیکن اقوام متحدہ کے صدر اور جنرل سیکریٹری نے اسکے لئے بھی ایک راہ نکال ہی لی — انھوں نے یہ مشورہ دیا کہ جنرل اسمبلی ابتداء میں صرف ان مسائل ہی پر غور کرے جن پر ووٹنگ کا سوال ہی پیدا نہ ہو اور اس طرح اس فضا میں جنرل اسمبلی کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ تین نو آزاد ممالک مالٹا، مالوی اور زمبیا کو اقوام متحدہ کا رکن بنا دیا گیا۔ اس طرح اقوام متحدہ کے اراکین کی تعداد ۱۱۵ تک پہنچ گئی۔

یہ ہنگامے ابھی چل ہی رہے تھے کہ امریکہ نے بلجیم اور برطانیہ کے گٹھ جوڑ کے ساتھ کانگو میں تاریخ کی بدترین اور ذلیل ترین مداخلت کی جس کا نام ان نام نہاد مہذب قوموں نے RESCUE MISSION رکھا — وہ مشن جس میں کانگو کے ہزاروں حریت پرست شہید ہوئے — وہ جارحانہ کارروائی جس نے کانگو ہی نہیں بلکہ پورے افریقہ کی توہین کی — اس کا نام کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ رکھا جائے حقائق پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا — اس پر پڑے ہوئے خوبصورت پردے سامراج کے مکروہ چہرے کو نہیں چھپا سکتے — پوری دنیا کے آزاد ممالک نے اس جارحانہ کارروائی کی شدید مذمت کی اور اسے سامراجی سازش قرار دیا — امریکہ ایک بار پھر افریشیائی اقوام کے سامنے اپنے ننگے سامراجی روپ میں آ گیا۔

کانگو پر امریکہ بلجیم کی جارحانہ مسلح مداخلت پر غور کرنے کے لئے ۲۱ ممالک (جن میں ۱۸ افریقی ممالک شامل تھے) نے سلامتی کونسل کا اجلاس طلب کیا اور اس میں افریقی نمائندوں نے سامراجیوں اور ان کے پالتو کتوں کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ انھوں نے کہا کہ دو سو سال پیشتر یہی سفید فام قومیں افریقہ اور ایشا کو تہذیب سکھانے کے "مشن" پر نکلی تھیں اور وہ تہذیب یہ تھی کہ دونوں براعظموں کے چپے چپے کو آپس میں بانٹ لیا اور یہاں کے باشندوں کے گلے میں غلامی کے طوق پہنا دیئے ان سفید فام قوموں نے دو صدیوں تک سیاہ فام باشندوں کے ممالک کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا اور جب کسی نے اس ظلم و استحصال کے خلاف آواز بلند کی تو ان پر ہر وہ ظلم کیا جو وہ کر سکتے تھے اور آج جب ایک ایک کر کے ہر ملک غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر پھینک رہے ہیں تو یہی لٹیرے ان پر دوسرے طریقوں سے قابض رہنا چاہتے ہیں اور دراصل اس نام نہاد حفاظتی مشن کا مقصد ہی یہ تھا کہ سامراجی ایجنٹوں کی حکومت کی حفاظت کی جائے۔ اور اس آواز کو دبا دیا جائے جو اس حکومت کے خلاف اٹھائی گئی تھی — عظیم لومبا نے جس مقصد کے لئے اپنی جان دی تھی اسی علم کو بلند کر کے قوم پرست افراد نے بغاوت کر دی اور یہ تحریک جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی اس صورت حال سے نبٹنے کے لئے کانگو کی حکومت نے بلجیم، رہوڈیشیا، جنوبی افریقہ سے کرائے کے فوجی بھرتی کئے تھے (اخراجات کا بار ظاہر ہے کہ امریکہ کے علاوہ کون اٹھا سکتا تھا) — جن کا محبوب مشغلہ قتل و غارتگری کرنا اور اپنی جیبیں بھرنا تھا اور جب وہ اپنے تمام تر وسائل کے باوجود لیوپولڈ دل پر قبضہ نہ کر سکے تو امریکہ کے ہوائی جہازوں پر بلجیم کی چھاتہ فوج "باغیوں" پر حملہ آور ہوئی۔ جدید ترین اسلحہ سے لیس ان فوجی درندوں نے قتل عام کیا۔ اور یہ سب اس وقت کی سب سے بڑی "جمہوریت" امریکہ کے اشاروں پر ہوا۔

افریقی نمائندوں نے شومبے کو "سامراجیوں کا پالتو کتا" کے خطاب سے نوازا اور کہا کہ جب تک یہ ذلیل ترین شخصیت کانگو کی سرزمین پر رہیگی اسوقت تک امن کی توقع کرنا فضول ہے۔ ان ممالک نے مطالبہ کیا کہ حریت پرست لیڈروں سے مذاکرات کر کے کانگو کے مسائل کو حل کیا جائے امریکہ کو پہلی بار اس ادارہ میں اتنے تلخ و ترش انداز میں دھتکارا گیا تھا۔ اور بلجیم کا وزیر خارجہ تو چلا اٹھا "اس ادارہ میں ایسی متعصبانہ باتیں پہلی بار کہی جا رہی ہیں — میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے" کو ان غاصبوں کو حیرت تھی کہ کل کے "غلام" آج آقاؤں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انکے سیاہ کارناموں کو افشا کر رہے ہیں۔

اقوام متحدہ سے کسی قسم کے حل کی توقع ہی فضول تھی اس نے ایک بے جان سی قرارداد منظور کر لی جس میں مطالبہ کیا گیا کہ۔

۱:۔ کانگو میں جنگ بند کی جائے۔
۲:۔ غیر ملکی کرائے کے فوجی نکال دیئے جائیں۔
۳:۔ غیر ملکی مداخلت بند کی جائے۔
۴:۔ ادارہ افریقی اتحاد کے ذریعہ اس مسئلہ کو حل کیا جائے۔

کانگو میں اب بھی جنگ ہو رہی ہے کرائے کے فوجی آج بھی کانگو میں دندناتے پھر رہے ہیں — اور اقوام متحدہ کچھ نہیں کر سکتی ہے۔ کیونکہ یہ کوریا کا مسئلہ نہیں ہے۔ کیونکہ یہ سنہ ۱۹۶۰ء کا کانگو نہیں ہے جہاں، لومبا کی حکومت تھی — بلکہ یہ شومبے کا کانگو ہے جسے سامراجی قائم رکھنا چاہتے ہیں

سامراجی اپنی براہ راست چالوں میں تو خیر زمانہ ہوا کہ مات کھا ہی چکے ہیں۔ اب تو ان کے بالواسطہ کرتب بھی لوگوں کی سمجھ میں آنے لگے ہیں — اقوام متحدہ جو کہ "دھوکے کی ٹٹی" کا روپ دھار چکی ہے اب زیادہ دن کٹھ پتلی کا کردار ادا نہیں کر سکتی کیونکہ نئی ابھرتی ہوئی آزاد و خود مختار طاقتوں نے پردے کے پیچھے اس کٹھ پتلی کی ڈوریاں ہلانے والے اتحادی ہاتھوں کو پہچان لیا ہے — اس سلسلے میں انڈونیشیا کے عظیم رہنما احمد سوئیکارنو نے جو جرأت مندانہ قدم اٹھایا ہے اس کے لئے وہ دنیا بھر کے ایماندار اور باشعور انسانوں کی داد تحسین کے حقیقی طور پر مستحق ہیں



ہم نو آبادیات اور ان کے حامیوں کے خلاف لڑتے رہیں گے (سوئیکارنو)

ہوا یہ کہ ۱۹ویں جنرل اسمبلی کے دوران انڈونیشیا نے اقوام متحدہ سے علیحدگی کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ اس بنیاد پر کیا گیا تھا کہ ملائیشیا نے مغربی آقاؤں کی اعانت سے سلامتی کونسل کی سیٹ پر قبضہ جما لیا ہے۔ ملائشیا کی ایک ایسے ادارے میں موجودگی جو اقوام عالم کی،

"سلامتی" کے لئے قائم کیا گیا ہو درحقیقت اس ادارہ کی "عظمت" کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیتی ہے۔ اور اسی لئے انڈونیشیا نے اقوام متحدہ سے علیحدگی کا فیصلہ کیا۔

انڈونیشیا کے سرکاری ذرائع کے مطابق یہ فیصلہ نئی ابھرتی ہوئی طاقتوں کو متحدہ اور مضبوط کرنے کے لئے کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس فیصلہ کا مقصد یہ بھی ہے کہ

یہ ظاہر کر دیا جائے کہ ایک ایسی اقوام متحدہ جس پر سامراجیوں کا قبضہ ہو۔ ایسا ادارہ ہرگز نہیں ہو سکتا ہے جس میں قوم پرست اقوام کے حقوق کی حفاظت کی جا سکے۔

ملائشیا اور انڈونیشیا کا جھگڑا دراصل سامراجیت اور آزادی، استعماریت اور خودمختاری کا جھگڑا ہے — یہ تو سب کو ہی علم ہے کہ ملائشیا کا قیام برطانوی اشارہ پر وہاں کے عوام کی مرضی کے خلاف عمل میں آیا تھا۔ کیونکہ برطانیہ جنوبی مشرقی ایشیاء میں اپنی فوج رکھنا چاہتا ہے۔ اور اس کے لئے ملائشیا سے اچھی جگہ کون سی ہو سکتی ہے جہاں اس کے اپنے فرمانبردار ملازم حاکم بنا دیئے گئے ہیں۔ اور آج ملائشیا میں ۵۰ ہزار سے زائد برطانوی فوج موجود ہے۔

انڈونیشیا اقوام متحدہ کو نفرت کی نظر سے دیکھنے میں حق بجانب ہے کیونکہ اقوام متحدہ کی زیرنگرانی نام نہاد ریفرنڈم کرا کے ملائشیا کا قیام عمل میں آیا تھا اور پھر ایشیائی ممالک کا یہ تجربہ ہے کہ جب امریکہ، برطانیہ اور دوسرے سامراجیوں کے مفادات پر ضرب پڑتی ہے تو اقوام متحدہ حرکت میں آجاتی ہے لیکن چھوٹے ملکوں کے مسائل پر کوئی توجہ نہیں دیتی۔ عرب کے ناسور اسرائیل کے قیام میں اقوام متحدہ نے سامراجیوں کے اشارے پر اہم ترین اور مرکزی کردار ادا کیا — یہی کہانیاں کانگو اور قبرص میں دہرائی گئیں — اقوام متحدہ ، رہوڈیشیا، جنوبی افریقہ کے عوام کے لئے کچھ بھی کرنے سے قاصر ہے، لاؤس، ویٹ نام میں امریکی جنگ بازوں کو نہیں روک سکتی ہے — موزمبیق اور انگولا کے عوام کو آزاد کرانے کے لئے کوئی مثبت قدم اٹھا نہیں پاتی — کشمیر کا مسئلہ حل نہیں کر سکتی کیونکہ "بڑی طاقتیں" یہ نہیں چاہتی ہیں — ایسی اقوام متحدہ یقیناً صرف اور صرف سامراجیوں کے جارحانہ اور غاصبانہ عزائم کو چھپانے والا ایک خوشنما اور دلآویز لبادہ ہے۔ افریشیائی ممالک کے لئے یہ



برطانوی فوج ملائشیا کی حفاظت (!) کیلئے روانہ ہو رہی ہے۔

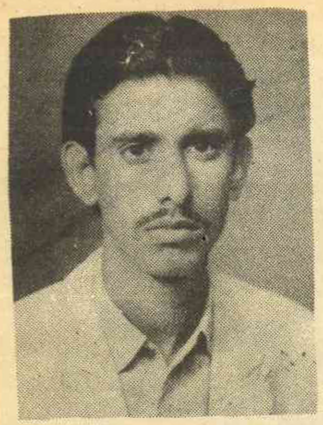
انڈونیشیا دل سے ہی ملائشیا کی مخالفت کر رہا ہے کیونکہ اس برطانوی نوآبادی سے صرف انڈونیشیا ہی نہیں بلکہ پورے ایشیاء کو خطرہ لاحق ہے لیکن اس سے انڈونیشیا خاص طور پر متاثر ہوتا ہے کیونکہ اسکی سرحدیں ملائشیا سے ملتی ہیں — پھر ایک ایسی حکومت جو برطانوی سامراج کے بل بوتے پر قائم ہو، جہاں برطانوی فوج ، موجود ہو۔ جو برطانوی اڈہ ہو بھلا سامراجیت کی بقاء اور نشوونما کے علاوہ کیا خدمت انجام دے سکتی ہے۔

لازم ہو گیا ہے کہ اس ظلم و جور کے "عظیم" بت کو توڑ کر نیا اور حقیقی پیکر تراشیں جو انکے مفادات ، انکے احساسات کا ترجمان ہو — اس بت کو توڑنے میں انڈونیشیا نے اپنا تاریخی کردار ادا کر دیا ہے۔

اب بھی وقت ہے کہ اقوام متحدہ کے طریقہ کار اور اسکی ہیئت میں بنیادی تبدیلیاں کی جائیں تاکہ وہ درحقیقت اقوام عالم کے مفادات کی نگرانی کر سکے ورنہ اقوام متحدہ کی موجودہ شکل، جو صرف استعماریوں

کے حقوق کی ضمانت کرتی ہے، یقیناً ختم ہو کر رہ جائے گی

— جو ممکن ہے بہت سی نظروں میں ایک المیہ ہو لیکن یہی ایک رزمیہ میں بھی بدل سکتا ہے اگر درحقیقت افریشیائی اقوام اپنی اہمیت کو جان لیں ، اپنی اہمیت کو منوا لیں —



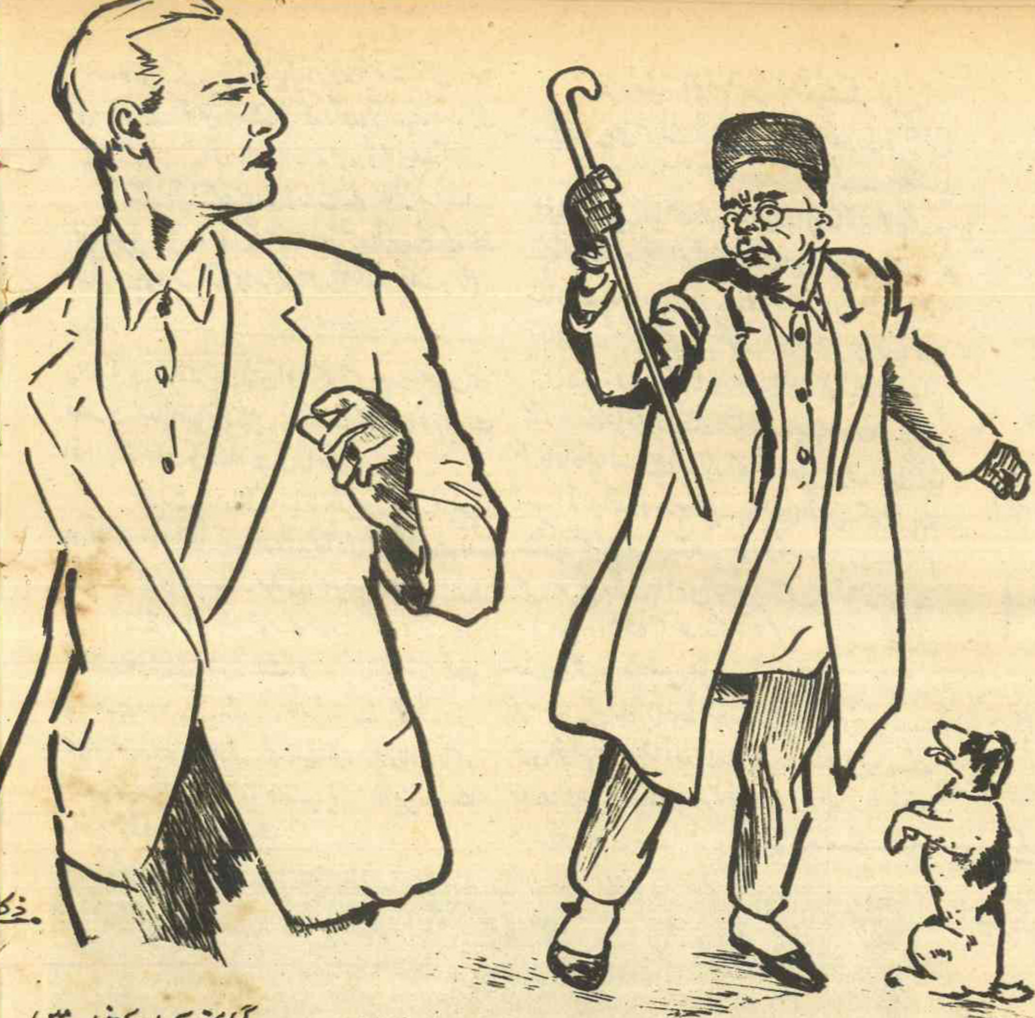
احسن جعفری

اجنبی شہر سے

آج پھر زخم تمناؤں کے لَو دیتے ہیں
لمحہ لمحہ مری تنہائی سے اٹھتا ہے دھواں
دل کے دامن سے لپٹتی ہیں سہانی یادیں
اب بھی تازہ ہے تصور میں جدائی کا سماں

کب سے روٹھی ہیں پذیرائی کی گھڑیاں مجھ سے
اب نہ وہ پیار کی شبنم ہے نہ رس ہے نہ مٹھاس
نرمیاں دستِ حنائی کی نہ وہ قرب کی آنچ
چھوٹ کر تجھ سے مرا شہرِ تمنا ہے اداس

سخت عالم ہے ترے ہجر میں اے راحتِ زلف
کس سے دکھ اپنا کہوں کس سے دلاسا چاہوں
سوچتا ہوں مرے ہمدم کہ بصد پیار و خلوص
اجنبی شہر سے سوغات تجھے کیا بھیجوں





سلمیٰ صدیقی

شیخ جی

میں جب نئی نئی اس نئے شہر میں یہاں رہنے کیلیے گئی۔ تو پتہ چلا کہ بڑے شہروں کی طرح اب چھوٹے شہروں میں بھی مکان ملنے میں مشکل پیش آنے لگی ہے۔ ہم لوگ ایک رشتہ دار کے گھر ٹھہر گئے۔ اور روزانہ صبح سے شام تک طرح طرح کے مکان دیکھنے جاتے رہتے تھے۔ مکان کی تلاش میں عجیب و غریب قسم کے مکانوں ہی سے نہیں عجیب و غریب طرح کے مالکوں سے بھی واسطہ پڑتا تھا۔ کہیں مکان اچھا ہوتا تھا تو مالک مکان چہرے مہرے سے نادر شاہ اور چنگیز خاں کے خاندان کے قریبی نظر آتے تھے کہیں مالک مکان انسان نما ہوتے تھے۔ تو مکان موہنجو داڑو اور ہڑپا کے کھنڈروں سے ٹکر لیتا نظر آتا تھا۔ کہیں مالک مکان اور مکان دونوں ہی غنیمت ہوتے تو وہ محلہ ایسا نظر آتا جہاں دور دور تک کھلنڈرے بچوں اور بازاری کتوں کی حکومت ہوتی تھی۔ کہیں مالک مکان نیک نظر آتا تو مالکن "نیک بخت" نہ ہوتیں کہیں مالکن ٹھیک ہوتیں تو مالک مکان شائی لاک قسم کے ثابت ہوتے۔ غرضیکہ مکان ڈھونڈنا ایک پرابلم بن گیا تھا۔ اور ہم خود اپنے میزبانوں کے لئے بھی ایک مصیبت بنتے جا رہے تھے۔ آخر سوچ بچار کر کے ایک ہوٹل میں بسیرا کیا۔ تو پتہ چلا کہ عنقریب وہ ہوٹل بند ہونے والا ہے۔ مکان کے سلسلے میں اخباروں کے اشتہار پڑھتے تو ہوش اڑ جاتے۔ ایسی ایسی کڑی شرطیں اس میں ہوتیں کہ ہم تو ہم ہماری آنے والی سات پیڑھیاں بھی ان آزمائشوں میں پوری نہ اتر سکتی تھیں کوئی مالک مکان اپنے مکان میں کنوارے کو رکھنا پسند نہ کرتے تھے کوئی بیاہے کو رکھنے سے انکاری تھے۔ کوئی پنجاب سے خار کھائے بیٹھے تھے۔ تو کوئی یوپی پہ ادھار کھائے رہتے تھے۔ کوئی صرف برہمن کی تلاش میں تھے اور کوئی صرف پارسی کے حوالے اپنا مکان کر سکتے تھے۔ کوئی بچوں والے کرائے دار کے حق میں تھے اور کوئی بچوں کی پوری قوم ہی سے بیزار تھے اور ہر دم اس بات پر کڑھتے رہتے تھے۔ آخر ان بچوں کا مصرف کیا ہے؟ اگر دنیا میں بچوں کی جگہ بڑے ہی بھیجے جاتے تو قانون قدرت میں کیا فرق پڑ جاتا۔ کوئی صاحب مکان تو پورا کرائے پہ دینے کو تیار تھے۔ لیکن گھر کا اکلوتا غسلخانہ صرف اپنے ہی قبضے رکھنا چاہتے تھے۔ کوئی صاحب غسلخانہ دیتے تھے تو دوسرے کمروں کو چھوڑنے کو تیار نہ تھے۔ ایک مالک مکان کو ریڈیو کی آواز سے نفرت تھی۔ دوسرے کلاسیکل موسیقی کے عاشق تھے۔ اور ہر دم تان لگاتے رہتے تھے۔ ایک مالک مکان عورت سے بیزار تھے۔ دوسرے اس پر ضرورت سے زیادہ مہربان نظر آتے تھے۔ ایک صاحب صرف سبزی کھانے والوں کو اپنا کرایہ دار رکھتے تھے۔ دوسرے کو ایسا کرایہ دار درکار تھا جو کم سے کم ایک بکرا دن بھر میں ہضم کر سکتا ہو۔ ایک صاحب کو شراب سے نفرت تھی۔ دوسرے اسی کا ناجائز دھندا کرتے تھے۔

وہ بڑی پریشانی کے دن تھے۔ شب و روز مکان کی تلاش جاری تھی۔ دن کے طرح طرح کے مکان دیکھتے دیکھتے آخر میں یہ حالت ہو گئی تھی۔ کہ رات کو خواب میں بھی طرح طرح کے مکان نظر آنے لگے تھے۔ گو وہ خواب بڑے عمدہ ہوتے تھے۔ ان خوابوں میں کچھ ایسا ہوتا تھا کہ مالک مکان تو انتہائی عاجزی اور اصرار سے مکان ہمارے حوالے کرتے تھے لیکن ہم بڑی نخوت اور غرور سے ان کی درخواست رد کر دیتے۔ ایک خواب میں تو سچ کہتی ہوں آپ کو چاہے یقین آئے چاہے نہ آئے۔ یہاں تک ہوا کہ شہر کے ایک کروڑ پتی بزنس مین جن کا عالیشان محل نما گھر میلوں کے گھیرے میں پھیلا ہوا ہے۔ ہمارے پاس پیدل چل کے آئے اور ہاتھ جوڑ جوڑ کے اپنا گھر ہم لوگوں کے حوالے کرنے لگے۔ اور خود اپنے محل کے سائے میں بنے والے جھونپڑوں میں معہ بیوی بچوں کے رہنے کا وچار کرنے لگے تھے لا لیکن صاحب ہمیں کسی کے محل سے کیا مطلب۔ بڑی بے مروتی اور لاپروائی سے ہم نے ان کا محل لینے سے انکار کر دیا۔ ہمارے انکار سے ان کے دل کو شاید بڑی چوٹ پہنچی تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے۔ کہ جب دوسرے دن ہم ان کی چال میں خالی ایک کمرے کو کرائے پہ لینے کے لئے ان سے ملنے گئے تو انہوں نے ہم سے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔

بڑی مصیبتوں کے بعد ہمیں ایک دوست

نے شیخ کرامت علی کا نام بتایا۔ جو بستی کے شریف اور معزز لوگوں میں شامل کئے جاتے تھے۔ بڑے مذہبی آدمی تھے۔ بہت غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور آٹھویں جماعت پڑھے ہوئے تھے۔ اور اتنے ایماندار تھے کہ کہیں بھی چالیس روپے ماہوار سے زیادہ کی ملازمت ان کو نہ ملتی تھی۔ آخر کار ایک بار کسی کمزور لمحے میں ایمانداری سے قطع تعلق کر کے جاپان پہنچ گئے اور وہاں سے جو بیس سال بعد لوٹے تو شیخ کرامت علی اینڈ سنز کے نام سے ان کی ایک فرم کھل گئی تھی وہ خالی چیزوں کا بزنس کرتے تھے۔ یعنی ڈالڈا کے خالی ڈبے۔ سگریٹ کی خالی ڈبیاں لکڑی کے خالی بکسے اور شراب کی خالی بوتلوں کا دھندا کرتے تھے اور اپنی فرم میں صرف ایسے ہی ملازم رکھتے تھے جن کے دماغ بھی خالی ہوں۔ شیخ جی اپنے اس "خالی" والے اصول کے بڑے پابند تھے۔ انہیں ہر خالی چیز اچھی اور مناسب نظر آتی تھی۔ سوائے خالی جیب کے!! خالی جیب والوں سے بہت بیزار رہتے تھے اور اسی لئے وہ خاص طور سے اپنے گھر میں جن لوگوں کو رکھنے کے حق میں سرے سے نہ تھے وہ رائٹر لوگ تھے وہ اکثر بڑی حقارت سے پڑھنے لکھنے والوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی موڈ اچھا ہوتا تو بچارے رائٹروں پر ترس بھی کھایا کرتے تھے۔!! وہ ہر جمعے کے دن میلاد شریف کرایا کرتے تھے۔ اور خود سر ہلا ہلا کے مناجاتیں سنا کرتے تھے۔ جب ہماری ان کے سامنے پیشی ہوئی تو وہ جمعہ کا دن تھا۔ اور شیخ جی میلاد شریف سن رہے تھے۔ ہم نے جا کے فوراً ہی ان کو سلام کیا۔ اور دھیرے دھیرے مناجاتوں پہ سر ہلانا شروع کیا۔ ہمارا یہ انداز شیخ جی کو بھا گیا اور انہوں نے ہم سے ہمارے کاروبار کے بارے میں پوچھا۔ اور جب ہم نے ان کو بتایا۔ کہ ہم لوگ کچھ قلم کاغذ سے شوق رکھتے ہیں۔ تو وہ بے حد خوش ہوئے اور بولے۔ "سمجھ گیا سمجھ گیا۔" آپ پلاسٹک کے فاؤنٹن پن اور کاغذ کے تھیلے بناتے ہیں۔ واہ واہ بڑا عمدہ بزنس ہے۔ خدا برکت دے۔ ہاں لیکن ذرا کرایہ وقت پہ......!"

"جی بالکل بالکل......!"

ہم لوگوں کو شیخ جی کے گھر رہتے ہوئے لگ بھگ تین ماہ ہو چکے تھے۔ شیخ جی بظاہر خوش نظر آتے تھے لیکن ان کو ہمارے گھر کی صفائی کچھ کھلنے لگی تھی۔ وہ خود گھر کے بڑے حصے میں رہتے تھے۔ اور ہمیں پوربی سمت کے دو کمرے انہوں نے دے رکھے تھے۔ انہیں اس بات پر اکثر غصہ آجاتا کہ اتنے بڑے مکان کے مقابلے میں ہمارے دو کمرے کچھ زیادہ صاف رہتے ہیں۔ اس کا ان کو خاص دکھ تھا۔ اس لئے اکثر آ کے ہمیں صفائی پہ لکچر دے جایا کرتے تھے۔ ان کے گھر میں کاکروچوں کی تعداد گھر والوں کے مقابلے میں بہت بڑھ جاتی تو فوراً ہمارے پاس آتے تو کاکروچ مارنے کی ترکیب دوا کا نام لکھوا جاتے تھے کبھی کبھی صبح صبح تہمد باندھے، آنکھوں میں سرمہ لگائے اور منہ میں پان دبائے۔ آجاتے تھے۔ اور صفائی کے فائدے پر اور پرسنل ہائی جین کے بارے میں کچھ ضروری باتیں بتا جاتے تھے۔

ایک دن میں صبح کی چائے پی کے برآمدے میں بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔ میرے شوہر اپنے کمرے میں تھے اور بچہ غسلخانے میں اچانک شیخ جی نازل ہو گئے۔ کچھ گھبرائے ہوئے سے تھے۔ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہے تھے جس سے پتہ چلتا تھا۔ کہ ہم سے کچھ خوش نہیں ہیں۔

"میں نے پوچھا۔ خیریت تو ہے شیخ جی؟"

بولے: "اجی خیریت کہاں۔ حیرت کی بات ہے۔ افسوس کی بات ہے۔ بڑے دکھ کی بات ہے یعنی بڑی عجیب بات ہے۔"

"میں نے گھبرا کے پوچھا، "آخر ہوا کیا؟"۔

"ہوتا کیا"۔ شیخ جی جھنجھلا کے بولے۔ "آپ کو ذرا سا خیال نہیں ہے۔ کچھ پتہ تک نہیں ہے۔ کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔ ویسے بڑے صفائی والے بنتے ہیں آپ لوگ"

میں نے بھی جھنجھلا کے پوچھا۔

"آخر کچھ بتایئے تو شیخ جی معاملہ کیا ہے؟"

شیخ جی نے لال پیلے ہو کے کہا۔

"ارے صاحب قصہ یہ ہے کہ۔ یہ جو آپ کے سونے کے کمرے کی کھڑکی کھلتی ہے نا۔ جہاں آپ کے شوہر بیٹھ کر لکھتے پڑھتے ہیں۔ اور جہاں آپ کا بچہ کھیلتا ہے وہاں تین دن سے ایک کتا مرا پڑا ہے۔"

"ارے رے رے!" میں چونک کے اٹھ گئی۔

شیخ جی نے اپنی ناک پہ رومال رکھ کے کہا۔

"حیرت ہے صاحب آپ کے کمرے کی کھڑکی ادھر ہی کھلتی ہے۔ اور آپ کو بدبو تک نہ آئی۔ ویسے بڑے صفائی والے بنتے ہیں آپ لوگ! ہم ساری رات سو نہیں پائے ہیں۔ حالانکہ ہمارے کمرے دوسری طرف ہیں۔"

یہ باتیں سن کے میرا شوہر اور بچہ اور مالی اور گھر کا ملازم اور بھنگی اور جھاڑو دینے والی بائی سب مجرموں کی طرح سر جھکائے شیخ جی کے پیچھے پیچھے مرے ہوئے کتے کی لاش دیکھنے پہنچے۔ کتا واقعی میری کھڑکی کے نیچے پڑا تھا۔ میں نے ابکائی روکتے ہوئے ناک پر ہاتھ رکھ لیا۔ شیخ جی نے ناک کو زور سے رومال سے جکڑتے ہوئے کہا۔ "دیکھئے دیکھئے یہ ہے وہ کتا۔ جو تین دن سے آپ کی کھڑکی کے سامنے مرا پڑا ہے۔"

یہ کہہ کے شیخ جی آگے بڑھے اور کتے کے قریب پہنچ کے جھک کے اسے دیکھنے لگے۔

یکایک کتے نے گھبرا کے آنکھیں کھولیں شیخ جی کو دیکھا اور سرپٹ بھاگا جنگل کی طرف!

منظر ایوبی

احساس

آج اسی شہر میں اجنبی ہو گئے!
کل تلک جس کے چہرے کا غازہ تھے ہم

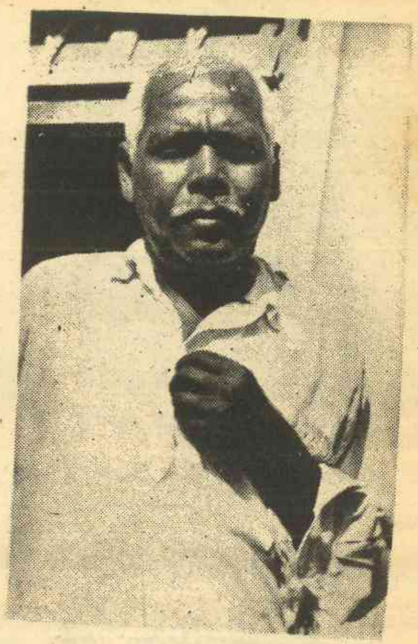
جس کی تعمیر و تشکیل و تزئین میں
سالہا سال تک صرف ہوتا رہا
اپنے اجداد و آبا کے دل کا لہو!
آج اسی شہر میں اجنبی ہو گئے

جس کی تاریک گلیوں کو روشن کیا
جس کی سڑکوں پہ اپنا پسینہ بہا
مانگ کر ماہ و انجم سے کچھ روشنی
جس کے ماتھے کی گہری سیاہی دھلی
آج اسی شہر میں ہو گئے اجنبی

کل تلک جس کی اونچی فصیلوں پہ ہم
حسنِ فطرت کے نغمات گاتے رہے
آسماں بوس پیڑوں کے سائے تلے
ماہ پاروں کی مانگیں سجاتے رہے
جس کی ٹھنڈی ہواؤں میں شام و سحر
زیست کو قہقہوں میں اڑاتے رہے
آج اسی شہر میں اجنبی ہو گئے

جس کی تاریخِ عظمت پہ اپنا قلم
زر نگارانہ جوہر دکھاتا رہا
شان میں جس کی لکھ کر قصیدے بہت
دھاک عزیزوں کے دل پر بٹھاتا رہا
آج اسی شہر میں اجنبی ہو گئے

کن نگاہوں کی جانے شرارت ہے یہ
دوستی، دشمنی یا عداوت ہے یہ
کل تلک جس کے چہرے کا غازہ تھے ہم
کل تلک جس جبیں کا ستارہ تھے ہم
آج اسی شہر میں اجنبی ہو گئے



چاچا علی جان

ایک شخصیت —— ایک خاکہ ——

خالد حمیدی
قیوم صدیقی

" اگر گلیکسو بے بی کی مونچھیں نکل آئیں تو؟" کسی نے پوچھا قیوم کی آنکھوں میں تیرتی ہوئی مسکراہٹ لبوں کے سنگم پر آکر ٹھہر گئی "اور اگر اسے چارخانے دار ٹپکا باندھ دیا جائے تو؟" قیوم نے ایک اور سوال داغ دیا۔
" تو پھر چاچا زندہ باد"! بات ایک قہقہے کے ساتھ ختم ہوگئی۔

یہ وہ موقع تھا جب ادارہ منشور کی جانب سے مغربی پاکستان مزدور کارکن کانفرنس کی مجلس قائمہ کے اراکین کے اعزاز میں ایک ظہرانہ دیا گیا تھا۔ چاچا علی جان اس موقع پر موجود تھے اور انکی شخصیت موضوع گفتگو تھی چہرے پر بچوں کی سی معصومیت۔ بالوں میں شب و روز کی کشمکش کا بھرپور عکس۔ سفید بالوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اس بات کا اعلان کر رہی تھی کہ آخر کار صبح کی سفیدی رات کی سیاہی پر غالب آکر رہے گی چاہے اس میں عمریں گذر جائیں چاہے جوانیاں لٹ جائیں۔ آنکھوں سے عزم ویقین جھلکتا ہوا باتوں کا انداز بے باکانہ اور بے پروایانہ دل میں دار و رسن سے الجھ پڑنے کا حوصلہ اور ہاتھوں میں استبداد کا گلا گھونٹ دینے کی قوت۔ یہ ہیں چاچا علی جان

چاچا کا انٹرویو منشور کے لئے حاصل کرنے کا فیصلہ ہوا تو ایک بار پھر ہم کو گھنٹوں چاچا سے باتیں کرنے کا موقع ملا۔ وقت کے تعین کی ضرورت ہی نہ تھی منگھو پیر روڈ کے قریب ٹریڈ یونینز کی مجلس رابطہ کے دفتر میں چاچا ہمیشہ ہی مل جاتے ہیں۔ شام کے وقت ہم اسی جگہ جا پہنچے اور چاچا ہمیں مل گئے۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر رفتہ رفتہ ہم حرف مطلب زبان پر لائے۔ چاچا اسوقت بڑے اچھے موڈ میں تھے وہ ساری باتیں جو ہم ان سے دریافت کرنا چاہتے تھے وہ بڑی روانی سے خود ہی بتلاتے چلے جاتے غضب کا حافظہ ہے چاچا کا سن اور تاریخ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کے واقعات یاد رکھنا آسان کام نہیں۔ ہم نے ان سے ابتدائی زندگی کے حالات دریافت کئے تو کہنے لگے کہیں تم کو سب ہی کچھ بتلائے دیتا ہوں جواب تک مجھ پر گذری ہے اور پھر انھوں نے بڑی تفصیل سے سارے واقعات سنا ڈالے مختصراً یہ کہ ۵۲ سال پہلے اڑیسہ میں ضلع بالیشور کے ایک قصبہ بھدرک گوجی ڈرہ میں پیدا ہوئے۔ والد ایک متوسط درجے کے زمیندار تھے بچپن خاصا اچھا کھیل کود کر گذر گیا دس برس ہوئے تو والد نے آنکھیں بند کرلیں ان کے بعد خاندانی جھگڑے شروع ہوئے۔ والدہ خود غرض اہل خاندان کا مقابلہ نہ کر سکیں اور تمام جائیداد ہاتھ سے نکل گئی۔ والدہ اور بڑی بہن کی ذمہ داری سر پر آپڑی خود دوبیڑی فروخت کرنے کی ملازمت کرلی جس کے عوض ایک آنہ روز مل جاتا۔ والدہ چکی پیس کر پیٹ پالنے کا سامان کرتیں اس طرح وہ عمر جس میں بچے لاڈ پیار میں پلا کرتے ہیں۔ باغوں میں جھولتے ہیں اور ذہن کو تعلیم کی دولت سے مالامال کرتے ہیں۔ چاچا نے وہ عمر مویشیوں کا سودا کرنے، گھر کی ذمہ داری اٹھانے اور جنگل کے کانٹوں سے اپنے تلوے زخمی کرنے میں گذار دی تاکہ بھوک سے پیٹ میں چبھنے والے کانٹوں کا علاج ہوسکے۔ انھوں نے یہ علم حاصل کر لیا کہ دنیا کی سب سے بڑی عظمت محنت ہے۔ یہ سوچ لیا کہ لوٹ کھسوٹ ہی جس معاشرے کا اصول ہو اس میں جینے کے لئے بازوؤں میں اتنی قوت کا ہونا ضروری ہے کہ ظلم کے پنجے کو گردن تک پہنچنے سے پہلے ہی مروڑا جا سکے۔ یہ جان لینے کے بعد قصبہ کی زمین چاچا کے لئے تنگ ہوگئی۔

گاؤں چھوڑا تو آسنسول اور کلکتہ میں چھوٹی چھوٹی، ملازمتیں بہ ہزار دشواری حاصل کرتے اور غیر مطمئن ہونے پر چھوڑ دیتے۔ آخر کار ۳۸ء میں برلا کی کاٹن مل میں کام کیا۔ یہاں پندرہ روپے ماہوار مل جاتے تھے سگرٹ نوشی، سینما بینی اور دوسری تفریحات سے واسطہ نہ تھا اس لئے اپنا پیٹ بھرنے کے بعد اس تنخواہ میں سے کچھ پس انداز کر لیتے۔ اس طرح والد کی وفات کے بعد جو قرضہ والدہ پر ہوگیا تھا وہ ادا کر دیا اور بہن کی شادی کے فرض سے سبکدوشی حاصل کرلی۔ اس کے بعد پھر کلکتہ گئے مگر وہاں بعض اعزا کی موجودگی کے باوجود کوئی ملازمت نہ مل سکی۔ کوئی عزیز سہارا دینے کو تیار نہ ہوا یہ تلخ تجربہ بڑا دل شکن ثابت ہوا اور پردیس جانے کی ٹھان لی۔ جیب بالکل خالی ہوچکی تھی مگر دل ہیجان سے بھرا ہوا تھا اسی عالم میں بغیر ٹکٹ ہاوڑہ اسٹیشن سے بنارس کے لئے روانہ ہو گئے۔ پٹنہ اسٹیشن پر بلاٹکٹ سفر کے جرم میں دھر لئے گئے اور زندگی میں پہلی بار سلاخوں کے پیچھے جا پہنچے۔ یہ واقعہ اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ چاچا کی زندگی میں انقلاب لانے کے لئے کافی تھا اور اسی سے ان کے کردار کا ایک بہت بڑا اور اہم پہلو سامنے آجاتا ہے۔ ہوا یوں کہ رات کے دو بجے چاچا کو پولس حوالات میں بند کر دیا گیا۔ بوڑھا سپاہی جو پہرہ پر تھا دروازہ بند کرنا بھول گیا اور کافی رات گذر جانے پر اپنی جگہ پر سو گیا چاچا باہر نکلے اور بھاگ کھڑے ہوئے جب کافی دور پہنچ گئے تو خیال آیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بوڑھے سپاہی کی شامت آجائے اور اس کی نوکری چلی جائے۔ یہ سب سوچا اور ذہن نے لحظہ بھر میں سپاہی کی آئندہ پریشانیوں اور مصیبتوں کا اندازہ لگالیا۔ قدم پیچھے کی طرف اٹھنے لگے جاکر سپاہی کو جگایا اور خود لاک اپ کے اندر چلے گئے صبح کو سپاہی نے اپنے افسر کو یہ واقعہ بتایا۔ اسنے چاچا کی دیانت داری دیکھتے ہوئے انھیں معاف کر دیا اور اسٹیشن سے باہر بھیج دیا۔ اب بھوک نے بے حال کر دیا۔ پاس کوئی ایسی چیز نہ تھی جسے فروخت کر سکتے

ہاں جسم پر کپڑے کافی معقول تھے جنکی وجہ سے کسی کے آگے ہاتھ بھی نہ پھیلا سکتے تھے جب بالکل ہی مجبور، ہو گئے تو ایک بھلے آدمی کو دیکھ کر اسے اپنی داستان سنائی - اس نے پوڑیاں اور آلو کی ترکاری دلوادی۔ کچھ کھائی اور باقی باندھ کر رکھ لی - ہائی کورٹ والی سڑک سامنے تھی جسکے دونوں طرف وکیلوں اور بیرسٹروں کے بنگلے تھے - ان بنگلوں میں چچا کے لئے کوئی ملازمت نہ تھی تھک ہار کر بچی کھچی پوری ترکاری حلق سے نیچے اتاری اور ایک درخت کے سائے میں لیٹ رہے - گھر یاد آنے لگا - مگر دل میں فیصلہ کیا کہ اب اسی حالت میں گھر جاؤں گا جب جیب میں کافی پیسہ ہوگا اسوقت انکی عمر تیرہ چودہ سال سے زیادہ نہ تھی مگر تجربات و حوادث نے انھیں بہت کچھ سکھا دیا تھا - انھیں بڑی ہمت مل گئی تھی

اسی شام ایک بیرسٹر نعمت علی کے بنگلے پر چچا گھومتے پھرتے جا پہنچے - بیرسٹر صاحب نے اپنے لڑکے کو بلایا - جو اسوقت چچا ہی کی عمر کا تھا - اور کہا کہ ہم تمہارے ساتھ کھیلنے کے لئے اس لڑکے کو رکھ لیتے ہیں - پھر چچا بیرسٹر صاحب کے لڑکے کو اسکول پہنچانے جاتے اسکی کتابیں اٹھاتے اور کیرم اور والی بال کا سامان سنبھالتے - یہیں اس لڑکے سے چچا نے کچھ پڑھنا سیکھ لیا زندگی مزے میں گذر رہی تھی مگر دل کو اطمینان نہ تھا - چچا اس ملازمت میں رہتے ہوئے گھر پیسہ نہ بھیج سکتے تھے لہٰذا ایک دن یہ نوکری چھوڑ دی اور پھر شہر در شہر گھومنے کا سلسلہ چل پڑا مختلف ملوں میں نوکری کی - گوالیار میں برلا مل کی نوکری نے ایک نئے تجربہ سے دوچار کیا - گوالیار میں دوسرے شہروں سے اکھٹا کر کے مزدور لائے جاتے تھے انکو بھرتی کا مزدور کہا جاتا تھا چچا بھی ان میں ہی شامل تھے —

مزدوروں پر بے انتہا سختیاں کی جاتی تھیں اور ریاست ہونے کی وجہ سے کوئی شنوائی نہ ہوتی تھی یہ ظلم و ستم کا کھیل چچا آنکھوں سے نہ دیکھ سکتے تھے انھوں نے مزدوروں کی حمایت میں آواز بلند کی اور اس ناقابل معافی جرم کی پاداش میں ملازمت سے برطرف کر دیئے گئے - وہاں سے دہلی پہنچے - مزدوروں کی حالت یہاں بھی دگرگوں پائی - ظلم کی چکی تو ہر طرف غریبوں کو پیستی رہتی ہے - کہیں باریک کہیں موٹا، کہیں باشعور مزدور ہوں تو اپنے حقوق کے لئے سینہ سپر ہوتے ہیں ورنہ دو پاٹوں کے درمیان ہڈیوں کا سرمہ بنتا رہتا ہے - دہلی میں اس وقت مزدوروں میں شعور بیدار ہو چکا تھا - وہ اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے انجام کار نوبت ہڑتال تک جا پہنچی - چچا نے مزدور لیڈروں کے ساتھ مل کر خوب کام کیا - بیس پچیس دن ہڑتال جاری رہی - شہریوں کی بھی ہمدردیاں ہڑتالیوں کے ساتھ تھیں - وہی ہڑتال کے زمانے میں ان کے کھانے پینے کا انتظام کرتے تھے آخر کار مزدوروں کو فتح ہوئی - برلا مل کے منتظمین نے مطالبات تسلیم کر لئے -

چچا اپنی زندگی کی طویل داستان سنا رہے تھے اور ہم موقع بموقع انکے چہرے پر ابھرتے ہوئے تاثرات کا جائزہ لے رہے تھے جب انھوں نے اپنی زندگی کی پہلی ہڑتال کی کامیابی کا حال سنایا تو جوش سے انکا چہرہ تمتما رہا تھا اور جب انھوں نے کہا "ہڑتال کامیاب ہونے پر ہم نے بڑی خوشی منائی - خوب بڑا جلوس نکالا اور اس جلوس میں برلا مل کے چمچوں کو گدھوں پر سوار کرا کے رائے سینا میں گشت کرایا" تو ہم نے دیکھا کہ نفرت کا شدید جذبہ انکے چہرے سے ظاہر تھا گویا وہ جانتے ہوں کہ مزدوروں کے سب سے بڑے اور سب سے ذلیل دشمن یہی "چمچے" تھے -

خیر! تو چچا نے داستان آگے بڑھائی دہلی سے کام چھوڑ کر چچا بھرتی میں بھوانی چلے گئے - وہاں جیل کے قیدیوں سے مل میں کام لیا جاتا - عام مزدوروں سے بھی قیدیوں کا سا سلوک کیا جاتا - دن میں دس یا بارہ گھنٹے عام طور پر کام کرنا پڑتا تھا کھانے کو مل میں کچھ نہ ملتا تھا سختیاں اور مظالم بے انتہا تھے حد تو یہ تھی کہ کوئی ملازم تنگ آکر کام بھی نہ چھوڑ سکتا تھا - بغیر اطلاع مل سے بھاگنے والوں کو چار چار اسٹیشنوں بعد سے بھی پکڑ لیا جاتا تھا اور درخت سے باندھ کر مار پڑتی تھی یہ حالات دیکھ کر چچا وہاں رک نہ سکے چپکے سے ریل میں سوار ہوئے اور ساتھی مسافروں کو اپنی حالت زار بتائی ایک شخص نے انکو سیٹ کے نیچے چھپا کر اوپر سے دری ڈال دی اس طرح چچا مخبروں کی نظر سے بچ کر کشن گڈھ جا پہنچے - یہاں پہنچنے پر آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والی مثال چچا پر صادق آئی -

کشن گڈھ کے رجواڑے میں زبردستی کام لیا جاتا تھا معاوضہ اگر مہربانی ہوگئی تو مل گیا ورنہ نہیں - کام سے انکار کرنے والوں کے پیر کٹھرے میں پھنسا کر انھیں مارا جاتا تھا - قصہ مختصر وہاں سے بھی چچا بھاگے اور بیاور جا کر دم لیا - ایک بار پھر تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد مختلف شہروں میں نوکریاں کرنے کا سلسلہ چل پڑا - یہاں تک کہ احمد آباد میں کچھ عرصہ جم کر ملازمت کی - اسی عرصہ میں پریم دروازے کے ایک اچھے گھرانے میں شادی ہو گئی اور پھر کافی عرصہ بعد ایک لڑکا تولد ہوا - انہی دنوں چچا کی اہلیہ کو چچا کے آبائی قصبہ کے کچھ لوگ مل گئے - اور ان سے معلوم ہوا کہ چچا کی والدہ حیات ہیں بیوی کے اصرار اور چھٹی نہ ملنے پر چچا ملازمت چھوڑ کر ماں کے پاس گاؤں چلے گئے - اٹھارہ بیس برس بعد ماں نے اپنے بیٹے کو دیکھا - مگر یہ ساتھ زیادہ عرصہ نہ رہ سکتا تھا - پیٹ کی آگ ماں کی محبت پر غالب آگئی اور چچا پھر احمد آباد چلے گئے -

یہ ۱۹۴۰ء کا زمانہ تھا اور احمد آباد میں ہندو مسلم کشیدگی کے بعد مسلمان قائد اعظم کی رہنمائی میں زور شور سے مطالبہ پاکستان کی حمایت کر رہے تھے - اس حمایت کے جرم میں انھیں بار بار فرقہ پرست غنڈوں کی چیرہ دستیوں کا شکار ہونا پڑا - فسادات کا سلسلہ ۱۹۴۷ء تک جاری رہا - پاکستان عالم وجود میں آگیا ۱۹۴۸ء میں ولیکا مل کی بنیاد رکھتے ہوئے قائد اعظم نے اعلان کیا کہ پاکستان کو صنعتی مزدوروں کی سخت ضرورت ہے - یہ اعلان ایک عرصہ تک چچا کے ذہن میں گونجتا رہا مگر پاس اتنا پیسا نہ تھا کہ پورے خاندان سمیت پاکستان آسکے - آخر جب متعصب ہندوؤں کے طعنوں سے تنگ آگئے تو ۱۹۵۲ء میں کھوکھرا پار کے راستے پاکستان آگئے اور ولیکا مل کے پاس ایک جھونپڑی میں بسیرا کیا -

چچا پاکستان آنے کے بعد کے حالات سنانے جا ہی رہے تھے کہ رابطہ کمیٹی کے کارکنوں نے چائے کا تکلف شروع کر دیا - سب چائے پی رہے تھے اور چچا دوسری طرف ایک مل مزدور سے اسکی ملازمت کی پریشانی کے متعلق مصروف گفتگو تھے ہم نے چائے پر بلانا چاہا تو معلوم ہوا کہ چچا چائے قطعی نہیں پیتے - سگرٹ، پان، سینما کسی بھی شوق سے چچا کو واسطہ نہیں اور اس اصول پر اس سختی سے کاربند ہیں کہ بعض دفعہ دوستوں نے شرطیں لگا ڈالیں مگر چچا کسی طرح چائے پینے پر تیار نہ ہوئے - یہ سن کر ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ جو شخص چھوٹے چھوٹے معاملات میں اصولوں پر اس سختی سے عمل کرتا ہو وہ اجتماعی اصولوں میں بھلا کس طرح جھک سکتا ہے -

چائے کے بعد چچا نے پھر واقعات کی کڑیاں، ملائیں - پاکستان آنے کے بعد انکی زندگی کے ہنگامہ خیز دور کا آغاز ہوا - اس دور کے واقعات چچا کی زبان میں ہی سنیئے -

"جھونپڑی میں سر چھپانے کے بعد مجھے نوکری کی فکر پڑی - جلد ہی "ڈائر مل" میں نوکری مل گئی ہم نے یہاں دوسری شفٹ چلائی اور بڑے عجیب حالات میں ۵۳ء تک کام کیا - تنخواہ بہت کم ملتی تھی اور ہمیں تین تین شفٹوں میں کام کرنا پڑتا تھا ہمارے دل میں صرف ملکی خدمت کا جذبہ تھا مگر دوسری طرف صنعتکار ہمیں ضروری سہولتیں دینے میں بخل سے کام کرتے تھے جب ہم نے دیکھا کہ ہماری نیک خواہشات یکطرفہ ہیں اور مل مالکان بار بار توجہ دلانے پر بھی انصاف سے کام نہیں لے رہے ہیں تو ہم نے ہڑتال کر دی - چودہ دن کی ہڑتال میں "زیب تن" "ولیکا" اور "ڈائر" ملیں بند رہیں یہ وہ زمانہ تھا جب نشتر صاحب وزیر صنعت تھے - وہ حالات جاننے کے لئے ملوں میں آئے تو ہم نے انکی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا اور انھیں اپنی مشکلات سے آگاہ کیا - وہ ہمیں ہمدردی کا یقین دلا کر چلے گئے - مگر عملاً کچھ بھی نہ کیا - دو دن تک ہم ان کے جواب کا انتظار کرتے رہے - اور پھر ہم نے پورے شہر میں مزدوروں کا جلوس نکالا - جلوس کے ساتھ ہم نشتر صاحب سے ملنے گئے اور وہ ہم سے نہ ملے ہم دن

بھرے بھوکے پیاسے اور تھکے ہارے مزدور مایوس ہو کر ملوں میں واپس آ گئے اور باہر بیٹھ گئے۔ اس موقع پر ہماری ہمدردی کے لئے کوئی بھی آگے نہیں بڑھا ہم مزدور اپنے اتحاد اور طاقت کے بل بوتے پر جدوجہد کرتے رہے ہم نے طے کر لیا کہ جب مرنا ہی ہے تو سسک سسک کر نہ مریں گے۔ جب مل مالکان نے دیکھا کہ ہم کسی طرح پیچھے ہٹنے والے نہیں ہیں تو ہمارے مطالبات منظور کر لئے گئے اس ہڑتال نے ہم کو بہت کچھ سبق دیئے ہم نے ایماندار لیڈروں کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا ان سے تحریک اور نظریات کا درس حاصل کیا میں نے خود کو اسی وقت سے مزدور تحریک کے لئے وقف کر دیا اور سمجھ لیا کہ قائداعظم کے بعد اس ملک میں کوئی ہمارا ہمدرد نہیں رہا ہے۔ ہمیں خود اپنا حق حاصل کرنا پڑے گا۔ میں نے مختلف ملوں میں کام کیا اور ۱۹۵۴ء میں "حبیب مل" میں ملازمت حاصل کر لی۔ اس وقت تک میرے دل میں تحریک کو ترقی دینے کے بڑے حوصلے پیدا ہو گئے تھے اور میں سمجھتا تھا کہ بغیر ملک کی سیاسیات میں حصہ لئے مزدوروں کے مسائل ہرگز حل نہ ہوں گے۔

چنانچہ میں نے آزاد پاکستان پارٹی میں شمولیت اختیار کر کے کام شروع کر دیا۔ پھر جب عوامی لیگ بنی تو اس کو اچھی جماعت سمجھتے ہوئے اس میں کام کیا اس لئے کہ مرحوم سہروردی صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ "میں مزدوروں کے لئے بہت کچھ کروں گا"۔ وہ خود میرے جھونپڑے میں ولایت آباد نمبر ۱، ۱۱/۱۰ میں آئے اور ڈیڑھ گھنٹہ ہم سے بات چیت کی۔ انہوں نے اور محمود الحق عثمانی صاحب نے ہمارے مسائل بڑی توجہ سے سنے اور اپنی طرف سے پورے پورے تعاون کا یقین دلایا مگر افسوس کہ جب وہ برسر اقتدار آئے تو انہوں نے اپنے وعدے پورے نہ کئے۔ اور ہم ان کی طرف سے مایوس ہو گئے۔ پھر مولانا بھاشانی نے نیشنل عوامی پارٹی بنائی تو میں اس میں شریک ہو گیا۔ مولانا نے عوامی لیگ کو چھوڑا تو ہم ان کی ایمانداری اور قربانیوں کو دیکھ کر ان کے ساتھ ہو گئے۔ اس وقت سے اب تک ہم نے دیکھا کہ ہر موقع پر مولانا بھاشانی نے مزدوروں اور کسانوں کے لئے کام کیا۔ ان میں یقین اور اتحاد پیدا کرنے کے لئے اپنے آرام کو قربان کیا اور انھیں ایک پلیٹ فارم پر لے آئے یہ جماعت اصلی تک کسانوں اور محنت کشوں کی جماعت ہے اور اسکے رہنماؤں پر ہمیں یقین ہے کہ وہ ہمیشہ غریبوں کا خیال کریں گے خاص طور پر مولانا بھاشانی کی شخصیت تو ایسی ہے جس پر مکمل اعتماد تمام مزدوروں کسانوں کے دل میں پایا جاتا ہے مولانا کی انتھک کوششیں اور ایماندارانہ رہنمائی دیکھتے ہوئے پورے بھروسے کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس وقت پورے ملک میں ان کے مقابلے کا سچا ایماندار نڈر اور مخلص رہنما دوسرا کوئی موجود نہیں۔

اچھا تو ہم اسی طرح نیشنل عوامی پارٹی اور مزدور تحریک کے لئے کام کرتے رہے کہ ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء کا نفاذ ہوا۔ مارشل لاء احکام سے مجبور ہو کر حبیب مل کی انتظامیہ نے ہم سے یونین بنانے کی درخواست کی ہم نے جمع ہو کر یونین بنائی اور اس کو رجسٹرڈ کرایا۔ جب یونین مضبوط ہو گئی تو ہم نے اپنے مطالبات انتظامیہ کے سامنے رکھے۔ ادھر مطالبات تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا گیا اور یہ کہا کہ مزدور اس یونین کے ساتھ نہیں ہیں۔ ہم لیبر ڈپارٹمنٹ میں گئے اور وہاں سارا حال بتایا انہوں نے حبیب مل کی انتظامیہ کے کہنے پر ہمیں حکم دیا کہ اگر مزدور تمہارے ساتھ ہیں تو الیکشن کرا لو۔ چنانچہ ہم نے ان کی بات مان لی اور ۱۹۶۰ء میں الیکشن ہوا اس وقت مل میں ۲۳۰۰ یا ۲۴۰۰ مزدور کام کرتے تھے کمپنی نے پورا زور لگایا کہ کسی طرح یونین کو ووٹ نہ ملیں مگر مزدوروں نے اپنے بزرگوں اور ایماندار رہنماؤں کا ساتھ دیا اور کمپنی کو زبردست شکست دی۔ کمپنی کے آدمیوں کی طرف ۱۶۶ ووٹ اور ہمیں ۱۹۳۶ ووٹ ملے۔ مزدوروں نے یہ کہہ دیا کہ ہم اپنی محنت اور قربانی تو کمپنی کو دے سکتے ہیں مگر اپنی یونین اور اسکے اتحاد کو ختم نہیں کر سکتے۔ ہم ہر جگہ کے مزدوروں سے اسی جذبہ کی توقع رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ سرمایہ داروں کے ہتھکنڈوں کو ناکام بنائیں۔

ان ہی دنوں میں عید آ گئی تو مل مالکان نے ہمیں عید ملنے کے لئے بلایا حبیب سیٹھ کے صاحبزادے عبدالرحمٰن نے ہمیں بٹھایا اور بڑی اچھی اچھی باتیں کیں۔ وہ اچھی اچھی باتیں یہ تھیں کہ ہم جو چاہیں لے لیں مگر مطالبات پیش نہ کریں۔ ہم نے ان سے کہا کہ آپ ہماری تنخواہ چاہے کم کر دیں مگر مزدوروں کے حقوق ضرور ادا کریں۔ ہم نے ان کے "کولر" کا ٹھنڈا پانی بھی پینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ہمارے مزدور ساتھی بوائلر کا گرم پانی پیتے ہیں تو ہم آپ کے "کولر" کا ٹھنڈا پانی کس طرح پی سکتے ہیں۔ ہم وہاں سے واپس آئے۔ مالکان نے ایک ماہ کا بونس دینا منظور کیا اور مزدوروں کے لئے "واٹر کولر" لگوائے دوسری طرف میرے متعلق غلط خیالات پھیلانا شروع کر دیئے کہا کہ اگر علی جان چلا جائے تو ہم مزدوروں کو زیادہ سے زیادہ دیں گے۔ چنانچہ میں نے ملازمت چھوڑ دی مگر دو مہینے بعد مزدوروں نے دوبارہ مجھے مل میں واپس بلا لیا اور یونین کا صدر منتخب کیا۔ جدوجہد پھر شروع ہوئی۔ لیبر ڈپارٹمنٹ اور مل مالکان نے گٹھ جوڑ کر لیا مجھے پھر ملازمت سے نکال دیا گیا اور بھی بہت سے مزدور نکال دیئے گئے اور وہاں ایک پاکٹ یونین بن گئی۔ میں کچھ روز بیکار رہنے کے بعد ٹنڈو آدم چلا گیا وہاں رتلام (ہندوستان) والے بشیر محمد مل گئے۔ یہ ہمارے پرانے ساتھی تھے اور ڈائر مل میں جنرل سکریٹری کی حیثیت سے کام کر چکے تھے۔ تھوڑے دن ان کے ساتھ کام کرنے کے بعد میں خیرپور چلا گیا۔ وہاں ڈاکٹر اعزاز نذیر موجود تھے جو کراچی سے مجھ سے واقف تھے۔ انہوں نے ملازمت کا انتظام کیا۔ دو ڈھائی ماہ کے بعد کمپنی کو معلوم ہوا کہ میں کراچی کی مزدور تحریک سے وابستہ رہ چکا ہوں چنانچہ انہوں نے کام کے دوران ہی مجھے بلایا اور کہا کہ تم خطرناک آدمی ہو اپنا حساب لو اور فوراً مل چھوڑ دو۔ میں گیٹ سے باہر آیا تو مزدوروں نے مجھے چھوڑنے سے انکار کر دیا مگر انھیں قانونی مجبوری بتائی گئیں تو انہوں نے کہا کہ تنخواہ ہم مزدور مل کر ادا کریں گے مگر علی جان کو جانے نہیں دینگے اس طرح آٹھ دس دن اور میں وہاں رہا۔ ادھر حبیب مل میں مزدوروں پر ظلم بڑھا تو کچھ مزدور ساتھی خیرپور مجھے لینے پہنچ گئے۔ اور میں واپس کراچی آ گیا۔

کراچی آ کر ایک بار پھر مجھے حبیب مل یونین کی صدارت سنبھالنا پڑی۔ مل میں مجھے ملازمت نہ ملی۔ مل کی حالت خراب تھی۔ پاکٹ یونین انتظامیہ سے معاہدہ کر چکی تھی جسکے تحت حاضری الاؤنس صرف دس روپے طے ہوا تھا۔ اور مزدوروں کے لئے سال میں ۲۶۰ دن کام کرنا ضروری تھا ہم نے ان چیزوں کے خلاف آواز اٹھائی اور کامیاب ہوئے ۲۶۰ دن کی پابندی ختم ہوئی، حاضری الاؤنس پندرہ روپے کیا گیا۔ اور بس الاؤنس ۵ آنے روز کیا گیا۔ یہ سب طے تو ہو گیا مگر انتظامیہ نے اس پر عمل نہ کیا اور ہمیں ہڑتال کرنا پڑی اس پر مالکان نے جنوری/فروری ۱۹۶۳ء میں تالہ بندی کر دی اور رات کے ایک بجے تمام مزدوروں کو گیٹ سے باہر نکال دیا۔ تالہ بندی کے وقفہ میں مل مالکان کے آدمیوں نے مزدوروں پر غنڈہ گردی کی اور ان کے سر پھوڑ دیئے۔ بے چینی بڑھنے کے بعد کیس لیبر کورٹ گیا اور ۲۵ سرگرم کارکنوں کو جنھیں انتظامیہ نے نکال دیا تھا انھیں کورٹ نے کام پر بھیجا اور کہا کہ کورٹ میں آخری فیصلہ بعد میں ہو گا پہلے ان ۲۵ مزدوروں کو کام پر لیا جائے۔ چنانچہ ہمیں کام پر لیا گیا۔ مگر بائیس دن کے اندر، مزدوروں میں انتشار پھیلا کر رمضان کے مہینے میں فروری کی پہلی تاریخ کو رات کے وقت پھر تالہ بندی کر دی گئی۔ جھگڑا بڑھا تعاون کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں لیبر کورٹ بھی مصالحت نہ کر سکی۔ بیس دن کے بعد حبیب مل کے گیٹ کے سامنے سے ہمیں پھر گرفتار کر لیا گیا۔ پولیس کے بیان کے مطابق ہمیں "زیب تن" مل کے میدان میں جلسہ کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اس گرفتاری میں سیکورٹی پریس یونین کے صدر اور رابطہ کونسل کے جنرل سیکریٹری محمد یامین، پاکستان ٹوبیکو کمپنی یونین اور رابطہ کونسل کے صدر نایاب حسین نقوی کو اور مجھے جیل بھیج دیا گیا کچھ اور مزدور بھی ہمارے ساتھ گرفتار ہوئے تھے۔ جیل میں قید کے دوران ہمیں اخبارات سے معلوم ہوا کہ منگھوپیر روڈ انڈسٹریل ایریا میں گولی چلا کے پولس نے تین مزدوروں کو شہید کر دیا اس کے دوسرے دن پورے منگھوپیر روڈ اور لانڈھی صنعتی علاقے میں ہڑتال ہو گئی۔ رات کے گیارہ بجے ہم سب گرفتار شدگان کو جیل سے نکالا گیا باہر آنے کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ، فائرنگ میں صرف تین نہیں بلکہ بہت زیادہ مزدور شہید ہوئے تھے اور لاتعداد زخمی ہو گئے تھے۔ ان قربانیوں کے بعد ہمیں وقتی کامیابی نصیب ہوئی مزدور اور مل مالکوں میں مصالحت کرا دی گئی ہماری ہمدردی میں

ہڑتال کرنے والوں کو ہڑتال کی پوری مدت کا اور باقی مل مزدوروں کو جو ایک ماہ آٹھ دن ہڑتال پر رہے تھے بیکاری کی مدت کا ۶۶ فیصد معاوضہ ادا کیا گیا۔ وارنٹ واپس لئے گئے۔ جن مطالبات پر اختلاف تھا ان کو سب کمپنیوں نے تسلیم کر لیا۔ ہم نے اور بھی کئی مطالبات باہمی گفت و شنید سے اپنی مل میں منظور کرائے۔ کینٹین میں دو پیسہ فی روٹی، دو پیسہ دال۔ ایک آنہ سبزی کی پلیٹ چھ پیسے اور تین آنے سبزی کی پلیٹ کا طے ہوا۔ ابھی چند ملیں بند تھیں اور وہاں کے مزدور اپنے جائز مطالبات کے لئے لڑ رہے تھے۔ ہم چاہتے تھے کہ ان کے مطالبات پرامن اور دوستانہ فضا میں طے ہو جائیں اور اس غرض سے رابطہ کونسل کے دفتر میں ایک روز میٹنگ کر رہے تھے یکایک پولس دفتر پر آئی اور ہمیں اور دیگر ساتھیوں کو جن میں محمد یامین، رؤف وارثی، نایاب نقوی، محبوب علی، محمد خان اور مولانا عبدالمالک شامل تھے گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد لودھی صاحب گرفتار ہوئے۔ ہمیں صدر کے تھانے میں رکھا گیا اور وہاں سے چالان کر کے جیل بھیج دیا گیا جیل میں سیکڑوں مزدور قید تھے یہ منگھوپیر اور لانڈھی کی ساری ملوں سے پکڑ پکڑ کر لائے گئے تھے اور جیل میں ٹھونس دیئے گئے تھے۔ ہمیں سیفٹی ایکٹ میں بند کر دیا گیا۔ طاہر زیدی، عباس زیدی ابن ایوب بھی ہمارے ساتھ تھے تھوڑے دن کے بعد ہمیں حیدرآباد بھیج دیا گیا۔ پھر لاہور لے جائے گئے اور آخر میں ۱۹ مارچ ۱۹۶۳ء کو کراچی لاکر چھوڑ دیا گیا چند روز بعد میں ایک کیس کے سلسلے میں کورٹ گیا ہوا تھا کہ مجھے جونیجو صاحب مجسٹریٹ کی عدالت سے پھر گرفتار کر لیا گیا۔ نہ وجہ بتائی گئی نہ وارنٹ پیش کیا گیا۔ ہتھکڑی پہنا کر پولیس کی گاڑی میں صدر لے گئے اور وہاں سے مجھے سکھر لے جایا گیا۔ جب مجھے ریمانڈ کے لئے پیش کیا گیا تو دریافت کرنے پر مجھے معلوم ہوا کہ سکھر کے کسی زمیندار نے مجھے پانچ ہزار روپے دیئے تھے کہ کراچی پہنچا دوں مگر میں نے خیانت کی اور روپیہ نہیں پہنچایا لہٰذا زمیندار کی درخواست پر مجھے گرفتار کیا گیا ہے۔ چہ خوب! میں نے کہا کہ میں زندگی میں پہلی بار سکھر آیا ہوں یہاں کی زبان تک نہیں جانتا میں تو کراچی کی حبیب مل یونین کا صدر ہوں مجھے اس معاملے میں کوئی واسطہ نہیں۔ مگر سب بے کار تھا۔ کوئی شنوائی نہ ہوئی مجھے جیل میں بند کر دیا گیا کچھ دن بعد سکھر کی گورنمنٹ ٹرانسپورٹ یونین کے نمائندے حافظ محمد یونس اور ڈاکٹر اعزاز نظیر کی کوششوں سے میری ضمانت ہوئی۔ پرانے سکھر کے ایڈوکیٹ رکن الدین قاسم صاحب نے مزدور بھائیوں کی ہمدردی میں بغیر فیس لئے ہمارے کیس کی پیروی کی۔ جب اسی کیس کے سلسلے میں اگلی تاریخ پڑنے پر سکھر آیا تو مجھے پھر گرفتار کر لیا گیا۔ اس دفعہ الزام یہ تھا کہ کلیم کا بہانہ کر کے ایک کلیمنٹ ڈوڈو شاہ سے ٹھگ لیا ہے خیرپور کے سٹی مجسٹریٹ کی عدالت میں مجھے پیش کیا گیا یہاں بھی باقر صاحب ایڈوکیٹ اور علی مختار جعفری صاحب ایڈوکیٹ نے میری ضمانت پیش کر کے مجھے چھڑایا میں کراچی آیا تو خیرپور میں میری ضمانت مسترد کر دی گئی اور مجھے جیل بھیج دیا گیا اور ایک بار پھر باقر علی صاحب ایڈوکیٹ نے میری ضمانت کرائی میں دوبارہ کراچی واپس آیا۔ یہاں مل مزدوروں کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی چنانچہ میں نے حبیب مل کے گیٹ پر تقریر کی اور جب میں جونیجو صاحب کی کورٹ میں پیش ہوا تو دفعہ ۱۰۷، اور ۱۱۷ کے تحت مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ چھ ماہ میں قید رہا۔ اس عرصہ میں پولس میرے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتی رہی مجھے ایک شہر سے دوسرے شہر کی جیل منتقل کیا جاتا رہا ایک شہر میں میری ضمانت ہوتی تو پہلے ہی پولس دوسری جگہ مجھے منتقل کر دیتی تھی وہاں ضمانت ہوتی تو کسی اور جگہ پہنچا دیا جاتا۔ اس طرح ضمانتیں ہونے کے باوجود مجھے قید رکھا گیا اسی دوران سکھر میں وکیل صاحب کی کوششوں سے فیصلہ میرے حق میں ہوا اور فریادی کو ایک سو روپے جرمانہ ہوا دوسرے کیس میں خیرپور میں راضی نامہ ہو گیا۔

اب میں کراچی واپس آیا اور یہاں آکر ایک بار پھر مزدور تحریک کے لئے کام شروع کیا تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ دفعہ ۱۰۷، اور ۱۱۷ کے تحت پھر سلاخوں کے پیچھے بھیج دیا گیا یہ کیس ابھی تک میرے اوپر چل رہا ہے ۶۳ء کی فائرنگ کا کیس بھی چل رہا ہے میرے اور دوسرے بہت سے ساتھیوں پر ابھی تک مقدمات جاری ہیں جنہیں نہ کوئی گواہی ابھی تک پیش ہوئی ہے نہ فیصلہ ہوا ہے"

چاچا کی پیشانی پر سلوٹیں سی نمودار ہو گئیں وہ کندھے پر پڑے ہوئے چارخانے دار رومال کا کونہ اپنی انگلیوں میں مسل رہے تھے۔ اور انکی نظریں کمرے کے کچے فرش پر جمی ہوئی تھیں۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد انھوں نے کہا "میں ایک مزدور اور کسان کا بیٹا ہوں میں نے بچپن جنگل کی آزاد فضاؤں میں گزارا ہے میں دوب کی طرح دب دب کر ابھرنے کی ہمت رکھتا ہوں میں مزدور ساتھیوں کو یقین دلاتا ہوں کہ ہمیشہ مزدور تحریک کے لئے کام کرتا رہوں گا ——"

چاچا اپنی زندگی کی پوری جھلک پیش کر چکے تھے ایک ایسی زندگی جو قید و بند کی صعوبتوں اور دکھ درد سے بھرپور تھی۔ مگر یہ دکھ درد ان کا اکیلے کا نہ تھا یہ پورے طبقے کا غم تھا۔ انکی لڑائی کسی ایک مل مالک سے نہ تھی یہ تو اس پورے سرمایہ دارانہ نظام سے برسرپیکار تھے جو محنت کش عوام کا خون چوس کر ملک کی ساری دولت اپنی تجوریوں میں بھر لیتا ہے۔

ہم چاہتے تھے کہ کچھ باتیں اور کی جائیں چنانچہ سلسلہ گفتگو جاری رہا اور مختلف سوالات کے جواب میں چاچا نے ہمیں بتایا کہ وہ لیبر لا آرڈیننس کی سختی سے مخالفت کرتے ہیں انکے خیال میں آزاد جمہوری ملک میں ہڑتال کا حق، مزدوروں سے نہیں چھینا جا سکتا انھوں نے یقین دلایا کہ وہ اس حق کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے آخر دم تک لڑیں گے اور پوری پوری قربانیاں دیں گے۔ چاچا اس وقت کسی سیاسی پارٹی سے منسلک نہیں ہیں۔ مگر مولانا بھاشانی کی نیشنل عوامی پارٹی کو غریبوں محنت کشوں کی جماعت سمجھتے ہیں اور انکی پوری ہمدردیاں اس جماعت کے ساتھ ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ٹریڈ یونین کی سیاست ملکی سیاست سے الگ ہے اور جب تک مزدور تحریک ایک سیاسی نظریہ کی حیثیت سے آگے نہیں بڑھے گی ملک کے مسائل اسی طرح رہیں گے۔ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں پرامن طور پر تحریک جاری نہیں رہ سکتی تحریک چلانے والوں پر ظلم و ستم ہوتے ہیں مگر اس طرح تحریک کو کچلا نہیں جا سکتا۔ چاچا کہتے ہیں کہ ہمارے بزرگوں نے ہم سے زیادہ تکلیفیں اٹھائی تھیں وہ ہم سے زیادہ کچلے ہوئے تھے۔ مگر ظلم کتنا بڑھتا ہے مدافعت کی طاقت بھی بڑھتی ہے ۶۳ء میں بیحد سختیاں ہوئیں۔ مگر یہ بات قابل غور ہے کہ اس زمانے میں اچھے، ایماندار اور جیالے لیڈر پیدا ہوئے تحریک کو تیزی سے آگے لے جا رہے ہیں چاچا اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ سوشلسٹ نظام ہی محنت کش کے مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔

ہم نے پوچھا کہ "کیا آپ کے پاس مزدور ساتھیوں کے لئے کوئی پیغام ہے؟"

"ہاں" چاچا بڑے زور سے بول اٹھے "میرا پیغام دنیا کے مزدوروں کا نعرہ ہے "ایک ہو جاؤ" سرمایہ داری کے خلاف سینہ سپر ہو کر آگے بڑھو اور مزدور حکومت لانے کی کوشش کرو"

چاچا کو یقین ہے کہ خلوص دل اور انتھک جدوجہد کے ذریعہ "مزدور حکومت" کے خواب کو ایک جیتی جاگتی حقیقت بنایا جا سکتا ہے"۔

رات کافی ہو گئی تھی اور ہمیں ایئرپورٹ واپس جانا ہے چاچا سے اجازت لے کر ہم رابطہ کونسل سے باہر نکلے چند مزدور ساتھی ہمیں سڑک تک چھوڑنے ساتھ ساتھ آئے۔ ان سے گفتگو ہوتی رہی اور یہ محسوس ہوا کہ سب ہی چاچا کا بیحد احترام کرتے ہیں ایک صاحب کہنے لگے چاچا تیس سال سے مزدور تحریک میں کام کر رہا ہے اس عرصہ میں کتنے ہی لیڈر پیدا ہوئے اور میدان چھوڑ کر بھاگ گئے مگر چاچا آج بھی اسی طرح بلکہ پہلے سے زیادہ بے جگری سے ڈٹا ہوا ہے"۔

دوسرے صاحب بول اٹھے "واقعی چاچا عظیم ہے" اور ایک بار پھر ہماری زبان پر یہ جملہ آ گیا۔

"چاچا زندہ باد"



رئیس امروہوی

وہ اوّلیں شعاع



کیلاش ماہر

وہ اوّلیں شعاع

مہرِ جہاں فروز کی وہ اوّلیں شعاع
تجدید و تازہ کاری و ایجاد و اختراع
تخلیق کی متاع
وہ اوّلیں شعاع

وہ اوّلیں شعاع

تاریکیِ عدم میں وہ تابانیِ ظہور
پیغمبرِ جمال و رسالت مآبِ نور
الہام آفرینشِ و بیداری و شعور
ہیئت گرِ سنین و رصد خانۂ شہور
عہد آفریں شعاع
وہ اوّلیں شعاع

وہ اوّلیں شعاع

نوخیز و نرم و نازک و نو فکر و نوجواں
اخترشناسِ مہر و نجومِ کہکشاں
افلاک کی نقیب - زمینوں کی ترجماں
میزانِ ہر زمان و ترازوئے ہر مکاں
ایجاد و اختراع
وہ اوّلیں شعاع

وہ اوّلیں شعاع

آئی وجود میں عدمِ بے پناہ سے
پہونچی ظہور تک ابدیت کی راہ سے
گذری رواروی میں ہر اک جلوہ گاہ سے
سیارہ و ثوابت و خورشید و ماہ سے
ہوتی ہوئی وداع
وہ اوّلیں شعاع

وہ اوّلیں شعاع

اس نیلگوں طلسم کی وہ سیم گوں پری
میرِ سپاہ زہرہ و ناہید و مشتری
پہنائے کائنات میں کرکے شنا وری
اتری ہے پستیوں میں بصد شانِ دلبری
وہ نازنیں شعاع
وہ اوّلیں شعاع

وہ اوّلیں شعاع

برق و شرار و شعلہ و سوز و دخان و دود
ویرانۂ حیات میں معمارِ ہست و بود
صنّاعِ کون صانعِ کُن صنعتِ وجود
دنیائے بے نمود میں اک مژدۂ نمود
پُرنور اطلاع
وہ اوّلیں شعاع

وہ اوّلیں شعاع

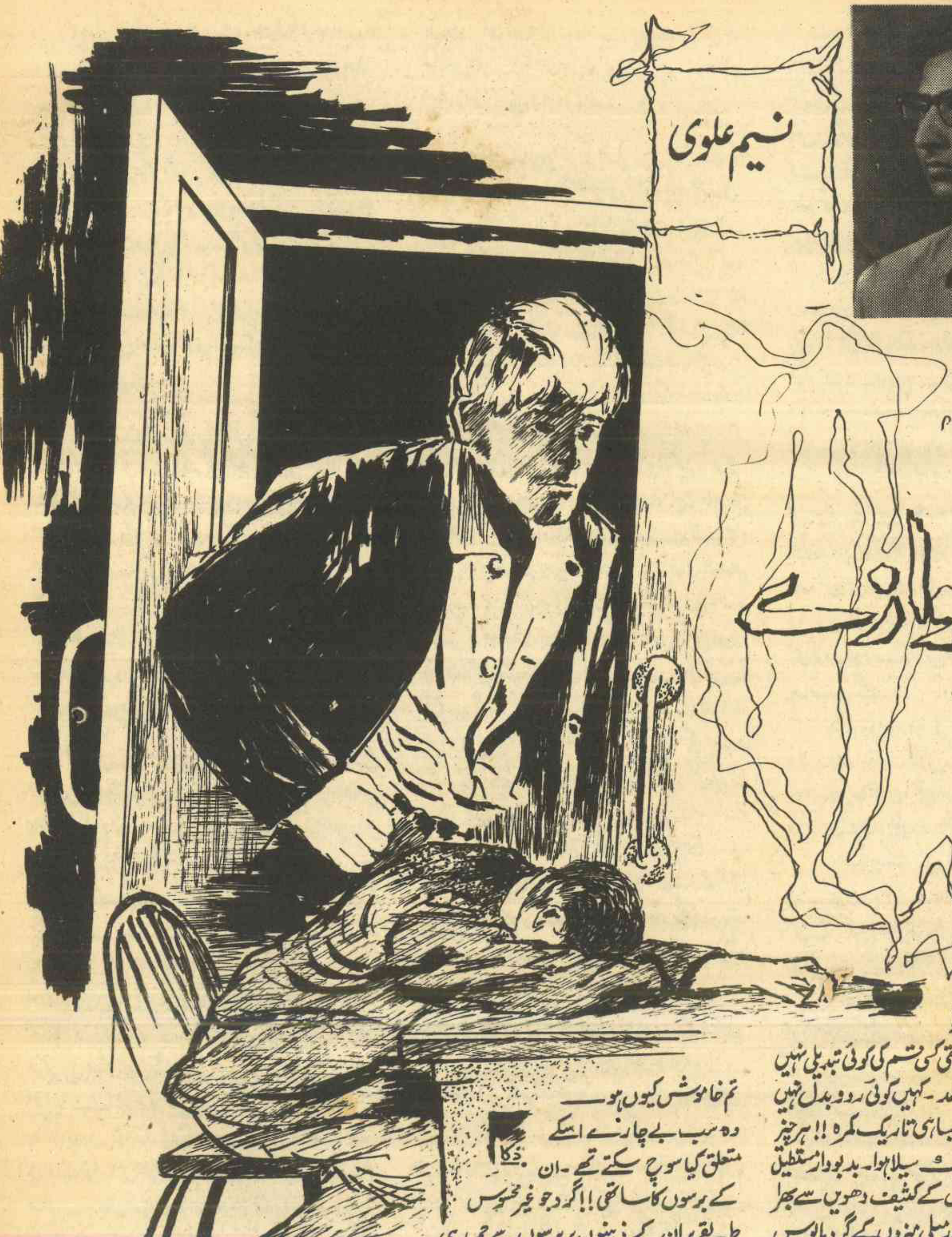
رفتارِ صوت و جنبشِ امواج و سیلِ نور
تحریکِ ارتقا و توانائی و شعور
اعصار کا شہود - تو ادوار کا ظہور
ہر منزلِ وجود سے کرتی ہوئی عبور
بے قید و امتناع
وہ اوّلیں شعاع

سوداگر

چاند کے دیس میں ہے جی کا زیاں سوداگر
مول کیا دو گے غمِ دل کا یہاں سوداگر
اب وہ اگلے سے یہاں مصر کے بازار نہیں
آ گئے شہرِ تمنّا میں کہاں سوداگر!
سہل اتنا تو نہیں روپ نگر سے جانا!
دور تک جائے گا آہوں کا دھواں سوداگر!
ہر گلی چپ ہے کہ آسیب کا سایہ جیسے!
شہرِ دل سے تری رخصت کا سماں سوداگر!
نقدِ جاں آئے ہیں بازار میں لے کر جب سے
ہو گئی جنسِ وفا اور گراں سوداگر!
دل کے ویران دریچوں پہ چراغاں کیسا!
کون دیتا ہے سرِ شام اذاں سوداگر!
دل کا ہر زخم ہے آئینہ تری صورت کا
تو نے دیکھی نہیں شیشوں کی دکاں سوداگر!



نسیم علوی



بند دروازے

آج ایک ہفتہ کی چھٹی کے بعد وہ واپس آیا تو دفتر کی ہر چیز بدستور تھی کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں ہر چیز ویسے ہی ساکت و جامد۔ کہیں کوئی رد و بدل نہیں وہی پژمردہ کلرک تھے ویسا ہی تاریک کمرہ!! ہر چیز جوں کی توں تھی۔ دفتر کا تاریک سیلا ہوا۔ بدبودار مستطیل کمرہ ویسے ہی سستی سگرٹوں کے کثیف دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ اونچی نیچی لنگڑی اور میلی میزوں کے گرد مایوس کلرکوں کے جھمگٹے ویسی ہی گاڑھی گاڑھی چائے کی پیالیوں میں سے اٹھتی ہوئی بھاپ میں اپنی تھکن گھول رہے تھے۔

اس نے جیب سے میلا رومال نکال کر کرسی کی گرد جھاڑی اور آہستہ سے اس پر ٹک گیا۔ اس کو یوں چپکے سے اپنی جگہ پر بیٹھتا دیکھ کر سب اس کے گرد جمع ہو گئے سب کے چہروں پر حیرت تھی ــ اسکی حالت؟؟ یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟؟" سب کی آنکھوں میں ایک ہی سوال تھا۔ ابھی کچھ دن پہلے تک تو تم ہم کو ہنسایا کرتے تھے۔؟ تمہاری شوخیاں کیا ہوئیں تمہارے لطیفے کہاں گئے ــ

تم خاموش کیوں ہو ــ

وہ سب بے چارے اسکے متعلق کیا سوچ سکتے تھے۔ ان کے برسوں کا ساتھی!! اگرد جو غیر محسوس طریقے پر ان کے ذہنوں پر برسوں سے جم رہی تھی۔ اب اسکی تہیں اتنی دبیز ہو چکی تھیں کہ اس میں سے روشنی کی ایک کرن کا گزرنا بھی محال تھا ــ پھر وہ کیا جان سکتے تھے؟ ــ کچھ بھی نہیں! اسکی خاموشی، اسکی پژمردگی ــ اور اسکی زار زار حالت!!! ــ

دفتر کا یہ تاریک کمرہ ایک دھواں اگلتے ہوئے کارخانے کی پشت پر واقع تھا جسکے شور سے اکثر کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی کارخلنے کی دور تک پھیلی ہوئی سپاٹ اور اونچی دیوار کی وجہ سے کمرہ میں ہوا کا گذر ممکن نہ تھا دیواریں جا بجا کمزور ہو چکی تھیں کہیں کہیں مکڑی کے جالوں میں پھنسی ہوئی چونے کی پپڑیوں سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ کسی زمانے میں دیواریں پالش شدہ تھیں غیر قلعی شدہ کھردری چھت سے اکثر مٹی جھڑا کرتی تھی دیواروں وغیرہ میں کوئی کھڑکی بھی نہ تھی جسکی وجہ سے دن میں بھی رات کا سا سماں رہتا تھا

کمرے کی مشرقی دیوار میں ایک بڑی سی کھڑکی تھی جو بڑے صاحب کے نئے تعمیر شدہ کمرے میں کھلنے کی وجہ سے ہمیشہ بند رہتی تھی گرمی میں سگرٹوں کے دھوئیں اور حبس کی وجہ سے کمرہ کال کوٹھری کا سا نمونہ پیش کرتا تھا تو سردیوں میں آئل اسٹو کی وجہ سے جو کمرہ گرم رکھنے کی خاطر جلایا جاتا تھا بیچارے کلرکوں کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے اور انکے لئے سانس لینا دوبھر ہو جاتا ـــــ صبح سے شام تک ـــــ کمرے کے وسط میں لٹکا ہوا ایک ساٹھ پاور کا بلب اپنی ناکافی روشنی سے کمرہ منور کرتا اور سارے کلرک کمر جھکائے لیجروں اور فائلوں اور رجسٹروں کی خانہ پری میں مشغول رہتے ۔

عرصہ سے ایک ہی روش اور یکساں طریقہ پر کام کرتے کرتے انکی کمریں جھک گئی تھیں آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے اور چہرہ سے وہ سب برسوں کے بیمار معلوم ہوتے تھے ـــــ دوپہر کمرے کی تکلیف دہ گھٹن میں دم توڑ کر شام کی سیاہی میں گھلنے لگتی تو سارے کلرک صاحب کے کمرہ میں آویزاں گھنٹے کے پانچویں گجر کے منتظر رہتے ـــ پانچ بجتے ہی انکے چہرے جگمگا اٹھتے ـــ انکا گھر، بیوی بچے، ساتھی ہمسائے، ہم جولی ـــ مسرت کے یہی دو لمحے انکی کل کائنات تھے ۔

کلرکوں کے اس سیلے ہوئے بدبودار کمرے کی مشرقی سمت میں ہمیشہ بند رہنے والی کھڑکی سے ملا ہوا صاحب کا شاندار کمرہ تھا جسمیں وافر مقدار میں ہوا اور روشنی حاصل کرنے کے لئے گرل لگی ہوئی لمبی لمبی کھڑکیاں تھیں جنپر منقش بھاری پردے پڑے رہتے تھے ۔ گرمیوں میں چھت کے پنکھے کے علاوہ صاحب کی جھولنے والی کرسی کے بائیں جانب ایک چھوٹا سا ٹیبل فین بھی تیزی سے گھوما کرتا تھا اور سردیوں میں برقی ہیٹر کے ذریعے کمرہ گرم رکھا جاتا تھا خودکار دروازے کے باہر اسٹول پر ایک بڑی بڑی سی مونچھوں والا خونخوار پٹھان بیٹھا جھوما کرتا تھا اور کمرے میں بغیر اجازت کسی کو داخل نہیں ہونے دیتا تھا ۔ "بڑا صاحب" واقعی بہت بڑا تھا ۔ کیونکہ وہ ایک منسٹر کا بھانجا تھا اور بی اے تھا ۔ اس کا باپ بہت بڑا بزنس مین تھا اور بڑا صاحب بہرحال اپنے ہی باپ کا بیٹا تھا چنانچہ وہ دوسروں کے مال میں اپنا منافع نکال لینے کے گر سے بخوبی واقف تھا ـــ اسکی کامیابیوں میں نئی ماڈل کی کاروں اور خود اس کی دل کو پگھلا دینے والی باتوں کا بہت بڑا حصہ تھا ـــ اکثر اوقات اس کے خود بخود بند ہو جانے والے دروازے کے پیچھے سے بڑی غیر فطری اور پراسرار سی آوازیں آیا کرتی تھیں جنکی اصلیت سے آفس والے سب ہی ملازم واقف تھے ـــ سرگوشیاں، سانسوں کی غیر فطری لرزشیں اور بے آواز لمسوں کے بعد ـــ غفور چوکیدار کسی نہ کسی سسکتی ہوئی زندہ درگور جوانی کو سہارا دیکر صاحب کی آرام دہ شیورلیٹ میں سوار کراتا نظر آتا

اور جب بھی ایسا ہوتا وہ سب جان جاتے کہ کل کسی خوش نصیب کی قسمت جاگنے والی ہے اور اس کو ڈیڑھ سو روپے ماہوار کی بھیک ملنے والی ہے ۔

سکندر کو ان پراسرار آہٹوں سے یکایک قادری یاد آجاتا ـــ موٹے موٹے شیشوں کی ٹوٹی ہوئی کمانی کی عینک لگانے والا قادری جو ہمیشہ جونا مارکیٹ سے پرانے کپڑے خرید کر پہنتا تھا اور جسکے گھر میں ایک وقت کھانا پکتا تھا ـــ وہ قادری کو بہت عرصے سے جانتا تھا ۔ اس وقت سے جبکہ وہ اسکول میں پڑھا کرتا تھا ۔ بیچارہ قادری !! ـ کتنا صحتمند اور خوبصورت تھا ان دنوں . . . . جب چپراسیوں کو مناتے اور صاحبوں کی خوشامد کرتے کرتے تھک گیا تو مجبوراً اس کو بھی اوروں کی طرح اپنی حوروں کی سی پاکیزہ بیوی کو بھی دھوکے سے صاحب کے پاس لانا پڑا قادری کا اپائنٹمنٹ ہو گیا اور اسکی بیوی بستر سے لگ گئی شروع شروع سکندر اکثر دیکھا کرتا کہ صاحب کے کمرے سے آتی ہوئی آوازیں سنکر قادری کا چہرہ سرخ ہو جاتا ۔ ہاتھ کی مٹھیاں کس جاتیں اور وہ غصہ کی شدت میں عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتا ـــ مگر اب تو وہ خود فائیلوں کی تہہ در تہہ انبار میں دبی ہوئی ایک شکستہ سی فائل تھا اسکی عینک کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی اداس آنکھیں اتنی گہری اور تاریک تھیں یا تو ان میں بدروحوں نے بسیرا لے رکھا ہو ـــ اسکے دو بچے تھے دونوں اپاہج ـــ ایک کانوں سے بہرہ اور دوسرا بصارت سے محروم دائم المریض بیوی اور دونوں زندہ درگور بچے قادری کے گھسٹتے ہوئے قلم کے سہارے جی رہے تھے ۔

قادری اور اسکی بیوی کے تصور کے ساتھ ہی سکندر کے ذہن میں حسین نجمہ کا خوبصورت اور معصوم چہرہ ابھر آتا جو غربت سے تنگ آکر ایک دن اس کے پڑوسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی یہ روح فرسا حادثہ یاد آتے ہی سکندر سن ہو جاتا ہاتھ، پاؤں کانپنے لگتے اور فائل کے صفحات پر پھیلے ہوئے کالے کالے لفظ بھنگوں کی طرح اسکی نگاہوں میں ناچنے لگتے ـــ کتنی محبت کرتا تھا وہ نجمہ سے !! مگر وہ کیا کرتا اچھا پہننے اچھا کھانے گھومنے پھرنے، سیر سپاٹے اور سینما کی شدید خواہشوں کو وہ کیسے پورا کرتا جیسے تیسے ہوتا وہ ہر تنخواہ پر نجمہ کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور لاتا ۔ کوئی اچھا پکچر آجاتا تو نجمہ کو ضرور لے جاتا . . . . مگر خوب سے خوب تر کی مانگ پوری کرنا اسکے بس میں نہیں تھا ـــ انھیں دنوں اس کے پڑوس میں سلطان آکر رہا ۔ چلتا پرزا آدمی تھا ـ چٹکی بجاتے میں لاکھوں کے وارے نیارے کرنے والا اپنی چاپلوسی اور

خوشامدانہ پالیسی کی بنا پر وہ شہر کے کسی آفس میں ہیڈ کلرک تھا ۔ اس نے جو غربت کی گود میں نجمہ کی پھول جیسی جوانی کو کملاتے دیکھا تو آہستہ آہستہ سکندر سے تعلقات بڑھا کر اس کے گھر میں آنا جانا شروع کر دیا ـــ پہلے تحفہ تحائف آئے اور پھر سیر سپاٹے کے پروگرام بننے لگے سکندر کا ماتھا ٹھنکا مگر بیوی کو خوش پا کر وہ خاموش رہا ـــ اور پھر اس خاموشی نے گل کھلایا !! ایک دن جب سکندر آفس سے تھکا ماندہ آیا تو سارا معاملہ ختم ہو چکا تھا اور نجمہ سلطان کے ساتھ غائب ہو چکی تھی ـــ اس حادثے نے اس کا دماغ ماؤف کر دیا تھا وہ چڑچڑا ہو گیا اسنے اس غم کو ہولے سے پی جانے کی کوشش کی مگر ایسا ممکن نہ ہوا وہ اندر ہی اندر آہستہ آہستہ گھلنے لگا ۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمایاں ہو گئے اور پھر کام کرتے کرتے اسکو اپنا بدن ٹوٹتا محسوس ہونے لگا ـ پھر ذرا سی محنت کرنے سے اسکی سانس پھول جاتی اور کوئی چیز جیسے اس کے گلے میں اٹکنے لگی ۔ اسکے دفتر کے سب ساتھی اس صورت حال سے پریشان تھے مگر ؟؟ ـــ وہ بھی کیا کرتے ؟ کیسے اس کے غم کو بانٹتے ؟ وہ سب بھی تو درد و کرب کی اس عظیم نہر میں حقیر تنکوں کی طرح بہہ رہے تھے ۔

ایک دن وہ ذرا دیر سے دفتر پہونچا تو دفتر کی کھڑکی دیوار سے اپنی سائیکل رکھتے ہوئے یکایک اسکو زور سے کھانسی اٹھی اور آنکھوں تلے نیلے پیلے انگنت دائرے ناچ اٹھے وہ سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا ۔

"مسٹر سکندر کیا بات ہے آجکل آپ روز لیٹ ہو رہے ہیں" وہ بڑے صاحب کی آواز سنکر بوکھلا گیا اس نے آنکھیں کھول کر کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن ۔ دوسرے ہی لمحے وہ چکرا کر زمین پر گر پڑا ۔

اور آج ایک ہفتہ کی بغیر تنخواہ چھٹی کے بعد دفتر میں انسپکشن کی خبر سنکر اس نے دوبارہ اپنی ڈیوٹی جوائن کی تو ہر چیز بدستور اپنی جگہ پر تھی مگر وہ خود اس مختصر عرصہ میں بالکل بدل گیا تھا ـــ اس کا جسم گھل کر ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا اور وہ وقت سے بہت پہلے بوڑھا نظر آنے لگا تھا اسنے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر سب کو دیکھا احمد، ممتاز، مختار قادری، اختر، زیدی، حمید . . . . اور پھر گرد آلود، فائیلوں کی تہوں کے نیچے سے کھینچ کر ایک بوسیدہ سا زردی مائل سفید کاغذ نکالا اور جلدی جلدی اس پر اپنا استعفا لکھنے لگا ۔

"یہ کیا پاگل پن ہے سکندر" برابر میں بیٹھا ہوا قادری سٹپٹا گیا ۔ "تم استعفا لکھ رہے ہو"

"ہاں ـــ مجھے معلوم ہے اب میں یہاں نہیں رہ سکتا ہوں ۔ اس نے نظریں اٹھا کر قادری کو دیکھا ۔ اور ایک پھیکی سی بے جان مسکراہٹ اسکے خشک ہونٹوں پر لرز کر رہ گئی ۔

• ابکے صاحب اور صاحب کے ساتھ آڈیٹر اور

آڈیٹر کے ساتھ اسکی بیوی کے آنے کی اطلاع ملی ــ اور پھر صاحب کے کمرے سے اٹھنے والی ہلکی ہلکی سرگوشیاں، بے ہنگم مردانہ قہقہے۔ چوڑیوں کی کھنک اور پیالیوں کی کھڑک ــ شور مچاتے کارخانے کی بے ڈھنگی آوازیں گم ہوتے رہے ــ دس منٹ ــ پندرہ منٹ ــ آدھا گھنٹہ ــ پون گھنٹہ ــ ایک گھنٹہ ــ

"سکندر ــ بابو صاحب نے آپ کو سلام بولا ہے"

ــ چھن ــ منتظر کلرکوں کے ذہن پر کوئی چیز گری ــ وہ چپکے سے کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "یہ سب میرے رفیق چھٹ جائیں گے جنکے ساتھ میں نے اپنی جوانی بتائی ہے کتنے اچھے لوگ تھے یہ سب ــ بالکل میرے بھائیوں جیسے" ــ اسکو ایکا ایک کھانسی اٹھی اس نے جلدی سے گل خاں کا بازو تھام لیا جو اسکو بلانے آیا تھا۔

صاحب کے کمرے سے یکایک سرگوشیوں کی آوازیں کچھ اور ابھر آئیں سکندر کو ایسا محسوس ہوا جیسے یہ آوازیں اس کا مضحکہ اڑا رہی ہوں ــ دو مردانہ آوازیں اور کبھی کبھی رس گھولتی ہوئی ایک نقرئی سی نسوانی آواز... نسوانی آواز سنتے ہی وہ گھبرا سا گیا اور ایک انجان سی میٹھی میٹھی کسک وہ اپنے دل میں محسوس کرنے لگا۔ جیسے دور یادوں کے شکستہ ویرانوں میں نجمہ بول رہی ہو اس نے دروازے پر کھڑے ہو کر ایک لمحہ اپنے کو تولا اور پھر خود کار دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا!!!

سامنے ہی صوفے پر سلطان اور نجمہ ایک دوسرے سے ملے ہوئے بیٹھے تھے۔ اسکی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اس نے آہستہ سے آگے بڑھ کر صاحب کی میز کا کونہ تھام کر آنکھیں موند لیں۔

ایک بے حس سی اداس خاموشی کمرے کے تلخ ماحول میں سسکنے لگی اسنے آنکھیں کھول کر نجمہ کو دیکھا جو سر جھکائے اپنی جوتی کی نوک سے قالین روند رہی تھی وہ اب کافی بدل گئی تھی اس کے زرد چہرہ پر شفتالو کی سی سرخی رچی ہوئی تھی اور ویران آنکھوں میں زندگی مسکرا رہی تھی۔

"مسٹر سکندر ہم آپکو یہ خوشخبری سناتے ہوئے مسرت محسوس کر رہے ہیں کہ مسز سلطان کی سفارش پر آپ کو ترقی دیکر مرکزی آفس بھیجا جا رہا ہے"

"جی" اسکی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ کمرے میں یہ خبر سننے تو نہیں آیا تھا۔

"شکریہ" اس کا ہاتھ جیب میں لرز اٹھا اس نے ایک لمحے کو سوچا اور پھر اپنا استعفےٰ صاحب کی میز پر ڈال کر وہ باہر نکل گیا۔

دروازے سے باہر قدم رکھتے ہی اسکو زور سے کھانسی اٹھی اور اسکو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اسکا سینہ کھرچ ڈالا ہو۔ اسکو اپنا منہ کڑوا سا معلوم ہوا اسنے گھبرا کر تھوکا تو سرخ سرخ جیتے خون کے تین بڑے بڑے دھبے ننگے فرش پر مسکرا اٹھے اس نے نفرت سے ان پر پیر رکھ دیا اور دفتر کے تاریک کمرے سے باہر نکل آیا۔

٭ ٭ ٭

غمِ پندار

جوہر میر

دل سمندر ہو کہ دریا ہو کہ اک ندی ہو
میں سمجھتا ہوں کہ میں کچھ بھی نہیں
میں کہ اک قطرۂ شفاف تو ہوں
صدفِ حسن سے محروم و جدا
اپنے معیار کا، منصب کا شہید
آپ ہی اپنا غلام
آپ ہی اپنا خدا
اپنے ہی حق میں ہوں فرعون و یزید
حق اگر سامنے آتا ہے تو باطل ہو کر
کھو گیا میں غمِ پندار میں شامل ہو کر
آئینہ عکس نمائی سے گریزاں ہے مرا
دلِ بھی تقدیر کی مانند پریشاں ہے مرا
شہر جنگل نظر آتے ہیں تو انسان شجر
یہ بھی بے برگ و گیاہ وہ بھی ہیں محرومِ ثمر
لوٹ لی کس نے مری ارضِ ہنر
اور افلاک گئے زیر و زبر
کوئی تخلیقِ جرائم کا سزاوار تو ہے
عکسِ شبنم ہی سہی، گل پہ مگر بار تو ہے
مرگِ احساس کا، احساس لئے کون جیئے
میں بھی سقراط ہوں یہ زہر مگر کون پیئے



عقلمند وہ ہے جو ہمیشہ ایک بیوی لانے کی سوچتا ہے مگر لاتا کبھی نہیں ——— پیٹرو آرتینو

ہر شخص کے یہاں ایک اچھے خاصے قبرستان کا ہونا بہت ضروری ہے تاکہ یہاں وہ اپنے دوستوں کے قصور دفن کر سکے۔ ——— ہینری وارڈ

اگر واقعی جنت کہیں ہے تو محبت ہی وہاں تک کی راہ ہے ——— طالسطائی

قومیت وہ جاہل مرغ ہے جو صرف اپنے ہی گھورے پر اذان دیتا ہے۔ ——— رچرڈ الڈنگٹن

ایک ہزار لائق انسانوں کے مرجانے سے اتنا نقصان نہیں ہوتا جتنا کہ ایک نالائق شخص کے صاحب اختیار ہونے سے۔ ——— عمرو بن العاص

اگر بھیڑیئے کو بھیڑیں چرانے کا کام سونپا جائے تو وہ اسے نعمت سمجھ کر فوراً قبول کرلے گا ——— ایک کہاوت

سمجھدار آدمی ہر بات کی امید خود اپنے آپ سے رکھتا ہے، بیوقوف دوسروں کی طرف دیکھتا رہتا ہے ——— جین پال

اگر آپ کے کچھ اصول ہیں تو ان پر قائم رہیئے کبھی نہ کبھی بات ضرور سنی جائے گی ——— ڈبلیو مون

جہاں بزدلی اور تشدد کے بیچ، ایک کا انتخاب کرنے کی بات ہو وہاں میں تشدد کے حق میں رائے دوں گا ——— گاندھی

ہماری مقدس سرزمین غلامی کی زنجیروں میں جکڑی جارہی ہے ملک کے طول و عرض سے ہنگاموں اور فریادوں کی آوازیں آرہی ہیں، ہمارے امراء، روسا فاقی اغراض کے لئے ملک کو غیروں کے سپرد کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھ رہے ہیں، آرلینز کی سرزمین پر فرانسیسیوں کا مقدس خون بڑی بیدردی سے بہایا جارہا ہے۔ اے ملک کے نوجوان فرزندو! اٹھو غیرت میں آؤ آزادی کے نشہ سے سرمست ہوکر دشمن کی صفیں الٹ ڈالو ——— جون آف آرک

طوفان اور برف پھولوں کو فنا کر سکتے ہیں لیکن بیج نہیں مرسکتے ——— جبران خلیل

اگر روزی عقل سے حاصل کی جاتی تو دنیا کے تمام بے وقوف بھوکے مرتے ——— سعدی

حد سے زیادہ مخلص نہ بنو، دراصل خلوص دو دھاری تلوار ہے، خلوص کی تلوار رکھنے والا اکثر خود ہی زخمی ہوجاتا ہے ——— آندرے موروس

دنیا میں جب ایک ذہین پیدا ہوتا ہے تو تم اس کو اس نشانی سے پہچان سکتے ہو کہ تمام کند ذہن اپنا ایک گروہ بنا کر اس کی مخالفت کرنے لگتے ہیں ——— سوئفٹ

محبت کاہل آدمی کا دل بہلاوا ہے ——— نپولین

ہم ہر جگہ ایک جبار و قہار دشمن کو اپنے سامنے پاتے ہیں، وہ بے رحم دشمن ہمارا افلاس ہے ——— مصطفیٰ فاضل پاشا

میرا پیشہ یہ ہے کہ جو کچھ میرے ذہن میں آئے اسے کہہ ڈالوں ——— والٹیر

دوستو! شکریہ۔ اگر تم خود پھانسی پر لٹکنا پسند نہیں کرتے تو ان لوگوں کی راہ کیوں روکتے ہو جو پھانسی پانا پسند کرتے ہیں؟ ارسائے

طاقت بغیر فوج کے نہیں، فوج بغیر دولت کے نہیں، دولت بغیر کھیتی کے نہیں اور کھیتی باڑی بغیر امن کے نہیں! اردشیر

میرے بچو! یاد رکھو کہ ظالم حکومت شیر سے بھی زیادہ خونخوار ہوتی ہے! آزادی کا بیج کبھی بارآور نہیں ہوتا جب تک کہ ظلم کے پانی سے اسکی آبیاری نہ ہو ——— وکٹر ہیوگو

ہم صرف اس لئے کہ تمہارے پاس عارضی طاقت ہے تمہاری برائیوں سے انکار نہیں کرسکتے ——— جوزف میزینی

زیادہ سے زیادہ سزا جو دیجاسکتی ہے بلاتامل دے دو، میں یقین دلاتا ہوں کہ سزا کا حکم لکھتے ہوئے جو جنبش تمہارے دل میں پیدا ہوگی اس کا عشر عشیر اضطراب بھی سزا سنکر میرے دل کو نہ ہوگا ——— ابوالکلام آزاد

اچھے خیالات بے باک بچوں کی طرح اچانک اور یکایک سامنے آکھڑے ہوتے ہیں اور چلا چلا کر کہنے لگتے ہیں "ہم یہاں ہیں۔ ہم یہاں ہیں"۔ گوئٹے

کارزار دنیا میں بے لڑے بھڑے کام نہیں چلتا یہاں چرکے بھی سہنے پڑتے ہیں، زخم بھی کھانے پڑتے ہیں، سر بھی دینا پڑتا ہے جو اس کے لئے تیار نہیں اس کے لئے چپ ہوجانا ہی بہتر ہے بلکہ سرے سے اسے اس میدان میں قدم ہی نہیں رکھنا چاہیئے ——— مولوی عبدالحق

جوانی ایک غلطی ہے، ادھیڑ عمری ایک کشمکش اور بڑھاپا تو خیر پشیمانی ہے ہی ——— ڈزرائیلی

سونے کا گھونگھٹ ساری بدصورتی چھپا دیتا ہے ——— ڈیکر



شمیم حنفی

قصہ فورٹ ولیم کالج کا

ناظرین با تمکین! یہ حقیر و فقیر تمہارے خلوص کا دم بھرتا ہے اور تم پر تحسین و آفرین کی بارش کرتا ہے۔ کہ تم داستان اسکی سنتے ہو اور سر اپنا دھنتے ہو۔

یہ فقیر پانچواں درویش کہا جاتا ہے اور حرف مطلب اس طرح زبان پر لاتا ہے کہ اب سے کوئی ڈیڑھ سو سال اُدھر دلی والے میر امن نے ایک کتاب بنام قصہ چہار درویش لکھی جس میں چار اللہ والوں کی داستان قلمبند کی لیکن اس فقیر کو لفٹ نہ دی۔ اس فقیر نے ہزار شکوہ کیا مر مر کر جیا، لخت جگر کھایا، اور خون دل پیا اور یہ شعر بہ رقت پڑھا کہ

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی —!

لیکن میاں میر امن نے یہ کہکر صاف انکار کر دیا کہ حکومت فرنگیوں کی ہے۔ زیادہ بولے گا تو مار کھائے گا اور اس جیل خانے میں ڈال دیا جائے گا کہ جو جگہ جگہ ولایت ہندوستان میں کہ ولایت کا تابع ہے، پایا جاتا ہے۔ اس پر یہ فقیر یوں گویا ہوا کہ جیل خانہ کسے کہتے ہیں۔؟

"جہاں لوگ چکی پیستے ہیں اور دکھ سہتے ہیں" میر امن نے بایں طور جواب دیا۔ یہ سن کر میں نے پھر سوال کیا —"یہ تو گھر میں بھی ہوتا ہے جہاں آٹا پستا ہے اور بچہ روتا ہے۔ کیونکہ گیہوں گھر والی کے بجائے کسی پڑوس کا ہوتا ہے۔!"

میر امن نے بہ نگاہ خشمگیں اس ناچیز کو دیکھا غصّے سے اس کے ہونٹ کپکپا گئے۔ یہ دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ کڑک کر بولا "تو انسان ہے یا پارلیمنٹ کا ممبر؟ سوالات کی بوچھار کرتا ہے! مثل زنانِ نحیف و نیم جان آنکھوں میں آنسو بھرتا ہے!"

میں نے رحم طلب نگاہوں سے اسکی طرف دیکھا اور اس بندہ خدا کو رحم آ گیا۔ شاید میرا یہ انداز اس کو بھا گیا۔ اس بار اس نے بڑے شیریں انداز میں کہا۔

"کاغذ کہاں سے لاؤں کوٹہ ختم ہو گیا —!"

"اس سے مانگو جو ہم پر حکومت کرتا ہے، عدل و انصاف کا دم بھرتا ہے" میں نے دھیرے سے کہا۔

لیکن ہزار منت و سماجت کے بعد بھی میں نے کچھ نہ پایا، دُرِ مقصد دست مراد تک نہ آیا اور میں خستہ و رنجور میر امن سے دور جان گلکرسٹ (JOHN GILCHRIST) کے پاس چلا گیا کہ پرنسپل اس کالج کا تھا جو فورٹ ولیم (FORT WILLIAM) کہلاتا تھا اور جہاں انگریز تعلیم اور میر امن روٹی پاتا تھا۔

جب یہ فقیر فورٹ ولیم کالج کے دروازے پر پہونچا تو نہ پوچھ کہ کیا دیکھا۔ اے عزیز! میں نے دیکھا کہ ایک صاف شفاف کشادہ دالان میں کہ آگے جس کے سرسبز و شاداب لان تھا میر بہادر علی حسینی، حیدر بخش حیدری، میر کاظم علی جوان، شیر علی افسوس، میاں مظہر علی ولا، مرزا علی لطف اور شری للو لال جی بیٹھے ہیں۔ ان سب کے سامنے بلوریں قلم دان میں قسم قسم کے قلم رکھے ہیں۔ کاغذ کا انبار لگا ہے۔

میں نے سوچا کہ میر امن مجھ سے جھوٹ بولا اور اس طرح اپنے کردار کا راز کھولا۔ یہ سوچ کر میں اداس ہو گیا اور اپنے خیالات میں کھو گیا لیکن ابھی اس عالم میں گم تھا کہ للو لال نے میری طرف دیکھ کر سر ہلایا پھر مجھے اپنے پاس بلایا۔

"تم نے کیا لکھا۔؟" میں نے للو میاں سے سوال کیا

"اے فقیر! خود دیکھ لے۔ اگر تیری آئی سائٹ (EYE SIGHT) ٹھیک ہو!"

میں نے دیکھا، پڑھا اور ہنس پڑا۔ پھر رونے لگا اور چہرہ آنسوؤں سے بھگونے لگا۔

میری گریہ و زاری دیکھ کر سب میرے گرد یکجا ہو گئے اور مجھ سے سبب رونے کا پوچھنے لگے۔

"بعد میں رویا پہلے ہنسا! اے فقیر اس ایکٹنگ (ACTING) کا راز بتا!" مرزا علی لطف نے لطف لیتے ہوئے کہا۔

"میں نے رو کر جواب دیا کہ اے علم والو! ذرا للو لال کے اس جملے پر نظر ڈالو! لکھتے ہیں" پراچین سمے میں ہمارا دیش سنسار کے سارے دیشوں میں سمان کی درشٹی سے دیکھا جاتا ہے، سونے کی چڑیا کہلاتا ہے میں وطن کی اس تعریف پر ہنسا پھر رویا اس لئے کہ آج وہ چڑیا کہاں اڑ گئی۔؟

"کمپنی بہادر نے چار سو بیس بلکہ آٹھ سو چالیس کے پنجرے میں بند کر لی ہے اور اپنی ہوس کی تجوری بھر لی ہے" میر بہادر علی حسینی نے بہت ڈر کر دھیرے سے کہا۔ یہ سنتے ہی سب کے چہرے پیلے پڑ گئے۔ حواس ڈھیلے پڑ گئے کہ ایک فرنگی اس جانب آ رہا تھا۔

سب نے کھڑے ہو کر، چہرہ عجز و انکسار کے پانی میں بھگو کر آداب کیا۔ میں بھی آداب بجا لایا اس نے میری طرف نظر نہ کی اور للو لال جی سے دریافت کیا۔

"ویل لالا۔ ٹوم نے کتنا لکھ ڈالا۔؟"

للو لال جی نے کاغذ اس کی طرف بڑھایا۔ پڑھتے ہی اس کا چہرہ لال ہو گیا۔ یہ دیکھ کر ہر شخص کہ اس جگہ موجود تھا بدحال ہو گیا۔ فرنگی کہ نام جس کا میر کاظم علی جوان نے اسی وقت چپکے سے جان گلکرسٹ بتایا گرج کر بولا۔

"ویل ٹمہارا انڈیا سارے ڈیشوں میں سمانِٹ ٹھا۔ کیا انگلینڈ سے اچھا ٹھا۔؟"

"ہرگز نہیں!" للو میاں کے حلق سے گھٹی گھٹی آواز نکلی۔

"پھر اس جملے کو کاٹو نہیں ٹو ٹمہارا پتّا کٹ جائیگا!" للو لال نے معافی کی درخواست کی جو قبول ہوئی

پھر اس فرنگی نے چہرہ اپنا میاں حسینی کی جانب کیا اور انھیں مخاطب کیا۔

"ٹوم نے وہ سارے لفظ یوز (USE) کر لئے؟"

"جی جی!" میاں بہادر علی حسینی بوکھلا گئے پھر سنبھل کر بولے "جی ہاں! لیکن اردو زبان کہ ملک ہندوستان کی ساری زبانوں سے آسان کہی جاتی ہے ان الفاظ کے استعمال سے مشکل ہو گئی ہے۔ اسکی سادگی

جانے کہاں کھو گئی ہے۔"
گلکرسٹ کا چہرہ لال ہو گیا۔ لیکن اس بار خوشی سے لال ہوا تھا۔ کہ لال رنگ ایسا ہی عجیب و غریب ہوتا ہے۔ اس نے ہنس کر کہا۔ "یہی تو ہم چاہتا ہے ایسی زبان لکھو کہ ہنڈی والوں کو غصہ آجائے! اور ٹم للولال ایسی بھاشا لکھے کہ ارڈو والے بگڑ جائیں۔ لنگویج یونیٹی (LANGVAGE UNITY) اچھی چیز نہیں ہے۔!"
میں نے سوچا یہ فرنگی ٹھیک ہی تو کہتا ہے۔ زبان قید وہاں میں رہنے کے باوجود گل کھلاتی ہے بولتی ہے تو سزا دلاتی ہے۔ کھانے کو نہ ملے تو، بھوک بھوک چلاتی ہے۔ ہندی اور اردو کا لبادہ اوڑھ کر فرقہ وارانہ فساد کی دھوم مچاتی ہے۔
پھر گلکرسٹ نے میری طرف نظر کری۔ میں نے ایک آہ سرد بھری اور اپنی بپتا کہہ سنائی کہ اگر دلی والے میرا من کو کاغذ کا کوٹہ مل جائے تو میرا غنچۂ امید کھل جائے کہ کہانی میری دنیا میں عام ہو تا کہ چاروں طرف میرا نام ہو۔!
اے عزیز! میری بات سن کر سب ہنسنے لگے اور میری چشم مایوس سے آنسو برسنے لگے۔ اس فرنگی نے کہ جس کا نام جان گلکرسٹ تھا ایک زوردار قہقہہ لگایا میرا شانہ زور سے ہلایا اور یوں چلایا کہ "ٹو روتا کیوں ہے؟ اپنی جان کھوتا کیوں ہے؟"
اس کی اس بات پر مجھے بھی غصہ آگیا اور میں نے کہا "تم ظالم ہو۔!"
"ٹوم مٹی کا ڈھیلا۔ کسی باغی کا چیلا معلوم ہوتا ہے!" گلکرسٹ جلدی سے بولا اور یہ سنتے ہی میں نے آگ بگولا ہو کر پھر اپنا منہ کھولا۔
"ہاں۔ میں باغی ہوں پھر؟"
"پھر کیا ٹوم کو ہم جیل میں ڈالے گا۔ جکویٹ کا عتاب ٹم کو کھائے گا!" گلکرسٹ گرجا لیکن برس نہیں سکا۔ جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں۔ یہ بات پرانی ہے۔ لیکن اے عزیز! ابھی نئی مانی ہے! میں نے غصہ میں کہا۔
"اے فرنگی! تو کیسی باتیں کرتا ہے؟ بھلا کوئی اس درویش کو بھی قید کر سکتا ہے۔ جو تو اس طرح کہتا ہے۔ اور مثل دریائے حماقت بہے بہتا ہے دیکھ! مجھ بدبخت کا نام وقت ہے کہ کام میرا سخت ہے۔ لیکن کسی کے روکے رکا نہیں پھر تو کیا روکے گا؟"
یہ سن کر سب کے چہروں پہ ہوائیاں اڑنے لگیں "وقت وقٹ؟ یو مین ٹائم؟" ۔ گلکرسٹ سہم کر دھیرے سے بولا پھر میری طرف نظریں اٹھائیں لیکن وہ مجھ کو وہاں نہ پا کر بے حد جھنجھلائیں کہ میں روانہ ہو چکا تھا اور اے عزیز وقت کوئی چور نہیں کہ پکڑ لیا جائے۔ یا اگر پکڑا بھی جائے تو اسکی لنگوٹی ہی ہاتھ آجائے!



علی ناصر زیدی

دلچسپ معلومات



★ — آجکل سمندر کے نمکیں پانی کو پینے کے قابل بنانے کے لئے تجربات ہو رہے ہیں لیکن بعض ساحلوں کے قریب بغیر کوشش کے میٹھا پانی مل جاتا ہے اور وہ اس لئے کہ وہاں قدرتی طور پر میٹھے پانی کے چشمے، موجود ہوتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ سمندروں کی تہہ کے نیچے کہیں کہیں کچھ چشمے جاری رہتے ہیں جہاں کہیں وہ تہہ کو چھوڑ کر سمندر کے پانی سے مل جاتے ہیں وہاں میٹھے پانی کا چشمہ موجود ہے۔ چونکہ میٹھا پانی نمکین پانی سے ہلکا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اوپر، اٹھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسی جگہ سمندر کی سطح پر بہت سے بلبلے نظر آنے لگتے ہیں۔

جن ملکوں میں پینے کا پانی مشکل سے ملتا ہے اور جن کے ساحل کے قریب ایسے چشمے موجود ہیں وہاں اس پانی کو اکھٹا کر لیا جاتا ہے۔ خلیج فارس میں جزیرہ بحرین واقع ہے۔ وہاں میٹھے پانی کی قلت رہتی ہے۔ اس کے علاوہ جنوبی سمندروں میں بھی بعض جزیرے ایسے ہیں جن کے قریب یہ چشمے پائے جاتے ہیں۔ وہاں کے لوگ سمندر میں غوطہ مار کر کنستروں میں چشمے کا میٹھا پانی بھر لاتے ہیں اور اس کے سہارے زندہ رہتے ہیں۔

پاکستان میں بھی سمندر کے پانی کو شیریں پانی میں تبدیل کرنے کے تجربات جاری ہیں پاکستان ایٹومک انرجی کمیشن اس سلسلے میں کافی سرگرمی سے کام کر رہا ہے۔ کمیشن نے ملک میں کئی تحقیقاتی مرکز قائم کئے ہیں جن میں لاہور، ڈھاکہ، ٹنڈو آدم اور اسلام آباد کے مراکز قابل ذکر ہیں۔

پاکستان ایٹومک انرجی کمیشن چاہتا ہے کہ، ساحل مکران تک تازہ پانی کی سپلائی ممکن ہو جائے تاکہ یہ وسیع علاقہ زرخیز بن جائے اور یہاں غذائی اشیاء پیدا ہونے لگیں کمیشن کے سائنس دان ایسے ذرائع ایجاد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جن کی مدد سے بحری پانی کو سستے طریق پر شیریں پانی میں تبدیل کر دیا جائے۔ جب یہ ممکن ہو جائے گا تو ساحل مکران آباد ہو جائے گا اور پاکستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ ایک حد تک حل ہو جائے گا۔

★ — سمندر کے سب سے گہرے حصے کا پتہ ۱۹۵۶ء میں لگایا گیا۔ وہ بحرالکاہل میں واقع ہے اور اس کا نام "میریانا زٹرینچ" ہے۔ وہاں سمندر پینتیس ہزار چھ سو چالیس (۳۵۶۴۰) فٹ یا ساڑھے چھ میل سے بھی زیادہ گہرا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہاں دنیا کی بلند ترین چوٹی، ماؤنٹ ایوریسٹ بھی غرق ہو جائے گی کیونکہ اسکی اونچائی صرف انتیس ہزار دو فٹ ہے!

اب سائنسدان ٹیلی ویژن کے ذریعے اپنے کمرہ میں بیٹھے ہوئے سمندر کے اندر کی سیر کر سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے خاص طرز کا ایک کیمرا استعمال کیا جاتا ہے جسے سمندر میں لٹکا دیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ تیز برقی روشنی بھی لگی ہوتی ہے جو سمندر کے اندھیرے کو دور کر دیتی ہے اور ٹیلی ویژن کے پردے پر وہ تمام چیزیں نظر آجاتی ہیں جو کیمرے کے سامنے موجود ہیں اب کسی غوطہ خور کو اس مقصد کیلئے سمندر کی تہہ میں اتارنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

اس کیمرے کو کسی جہاز کے عرشہ سے سمندر میں لٹکا دیا جاتا ہے۔ جہاز کے ایک کمرے میں ٹیلی ویژن سیٹ رکھا ہوتا ہے — سائنس داں اسکے پردے پر بحری مخلوق کی تصویریں دیکھتے رہتے ہیں اس طرح سائنس ترقی کرتی ہے۔

★ — سمندروں میں نمک، گھاس پھوس اور مچھلیوں کے علاوہ اور بھی بہت سی کارآمد چیزیں پائی جاتی ہیں۔ ان میں چند قیمتی کیمیاوی اجزا اور کچھ معدنیات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مثلاً ایک مکعب میل (ایک میل لمبا، ایک میل چوڑا اور ایک میل گہرا) سمندری پانی میں یہ چیزیں موجود ہوتی ہیں — بارہ کروڑ تراسی لاکھ ٹن سادہ نمک ایک کروڑ اسی لاکھ ٹن میگنیشیم کلورائڈ، اٹھتر لاکھ ٹن میگنیشیم سلفیٹ، انسٹھ لاکھ ٹن کیلشیم سلفیٹ اور تین لاکھ ساٹھ ہزار ٹن میگنیشیم برومائڈ ان سب کے علاوہ اس میں تھوڑی تھوڑی مقدار میں آیوڈین، لوہا، تانبا، چاندی اور سونا بھی شامل ہوتا ہے۔

سائنس دان ان اجزاء کو اسی نسبت سے آپس میں ملا کر بحری پانی تیار کر سکتے ہیں لیکن انسان کے بنائے ہوئے اس پانی میں وہ جانور زندہ نہیں رہ سکتے جو سمندر میں تیرتے پھرتے ہیں۔ اگر سائنسدان اپنے بنائے ہوئے بحری پانی میں تھوڑا سا اصلی سمندری پانی بھی شامل کر دیں تو پھر وہ تمام جانور اس میں بھی زندہ رہ سکتے ہیں۔

★ — دنیا میں برف کی کمی نہیں۔ ہمالیہ، الپس اور راکیز جیسے پہاڑوں پر اس قدر برف گرتی ہے کہ چوٹیاں اس کے وزن کو نہیں سہار سکتیں۔ برف کے بڑے بڑے تودے پھسل پھسل کر نیچے گرتے رہتے ہیں۔ انھیں "ایولانشے" کہتے ہیں۔ برف کا تودا نیچے آتے آتے آس پاس کی برف کو اپنے ساتھ ملاتا رہتا ہے۔ بھاری ہو جانے کی وجہ سے اسکی رفتار بھی زیادہ ہو جاتی ہے اور جو چیز بھی اسکی راہ میں آجاتی ہے وہ دب کر رہ جاتی ہے

برف کے یہ عظیم تودے زیادہ تر موسم بہار میں پھسلتے ہیں کیونکہ گرمی آنے کے ساتھ ساتھ ان کے نیچے کی برف پگھلنے لگتی ہے اور وہ جگہ چھوڑ دیتے ہیں

بعض اوقات انکی رفتار ۱۰۰ میل فی گھنٹہ تک پہنچ جاتی ہے۔ سوئٹزرلینڈ میں کوہ الپس پر ایک ایولانشے، ایسا دیکھا گیا تھا جس میں کوئی پچاس ٹن برف تھی جب برف کا یہ پہاڑ تیزی سے نیچے پھسلتا ہے تو ہوا بھی تیز چلنے لگتی ہے۔ اور بعض اوقات نصف میل آگے تک کے درخت اور مکان گرا دیتی ہے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ برف کا کوئی تودہ پھسلنے کے قریب ہے لیکن اپنی جگہ نہیں چھوڑتا۔ ایسے نازک موقع پر ذرا سا شور بھی اسے پھسلانے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوئٹزرلینڈ میں بہار کے موسم میں کوہ پیماؤں اور برف پر پھسلنے والے کھلاڑیوں کو شور مچانے یا زور سے بات چیت کرنے سے روکا جاتا ہے۔

★— دنیا کا سب سے بڑا اولا جسے پگھلنے سے پہلے تولا گیا اور جس کی تصویر لی گئی ۱۹۲۸ء میں نبراسکا میں گرا تھا۔ اس کا گھیر سترہ انچ اور وزن ڈیڑھ پونڈ تھا۔

★— جزائر غرب الہند میں ایک جزیرہ ہے جس کا نام، "ڈومی نیکا" ہے وہاں ایک جھیل ہے جو ہر وقت کھولتی رہتی ہے۔ یہ جھیل ۲۳۰۰ فیٹ کی بلندی پر ایک پہاڑ کے ڈھال پر واقع ہے اور جنگل میں چھپی ہوئی ہے۔ اس کی چوڑائی ۳۰۰ فیٹ ہے اور کنارے پر ہی اسکی گہرائی بھی تین سو فیٹ ہے۔ آج تک کسی نے اسکی بیچ کی گہرائی معلوم نہیں کی اس کا پانی ہر وقت کھولتا رہتا ہے چونکہ اس میں گندھک اور دوسرے کیمیاوی اجزاء بھی شامل ہیں اس لئے اس کا درجۂ حرارت نقطۂ جوش سے بھی زیادہ رہتا ہے۔ پانی ۲۱۲ درجے فیرن ہائٹ پر کھولنے لگتا ہے لیکن اس جھیل کے پانی کا درجہ حرارت ۲۱۹ ڈگری فیرن ہائٹ رہتا ہے۔

اس جھیل کی تہہ سے بہت سی گیسیں اوپر اٹھتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے اس کی سطح پر بلبلے پیدا ہوتے رہتے ہیں جس طرح کھولتے ہوئے صابن پر دکھائی دیتے ہیں بعض بلبلوں کا قطر تیس فٹ تک پہنچ جاتا ہے اور کبھی کبھی پوری جھیل پر صرف ایک بلبلہ چھایا نظر آتا ہے۔ پھٹنے سے پہلے یہ بلبلے دس فٹ کی اونچائی تک پھول جاتے ہیں۔ ان کے پھٹنے سے بڑی زہریلی گیس خارج ہوتی ہے بعض سیاحوں نے اسے سونگھنے کی کوشش کی اور وہ مر گئے۔

کیلی فورنیا کی ایک وادی میں ایک خشک جھیل واقع ہے جس نے سائنسدانوں کو پریشان کر رکھا ہے اس پر بڑے بڑے پتھر پڑے ہیں۔ جن میں سے بعض کا وزن پانچ سو پونڈ تک ہے۔ ان پتھروں نے کیچڑ پر ایسے نشانات ڈال دیئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹ کر ادھر ادھر حرکت کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ وہاں کسی آدمی یا گاڑی یا جانور کے پیروں کا کوئی نشان نظر نہیں آتا پھر یہ پتھر کس طرح حرکت کرتے ہیں؟

سائنسداں ابھی تک اس راز کو نہیں سمجھ سکے آج تک کسی آدمی نے ان پتھروں کو اپنی جگہ سے ہلتے جلتے نہیں دیکھا۔ ممکن ہے بارش کے وقت وہاں کی زمین پر پھسلن پیدا ہو جاتی ہو اور تیز ہوائیں ان پتھروں کو ادھر ادھر دھکیل دیتی ہوں۔ کچھ بھی ہو ابھی تک یہ معمہ حل نہیں ہو سکا۔

★— چاند کے مقابلے میں سورج چار سو گنا بڑا ہے لیکن ہم سے اس کا فاصلہ بھی اتنا ہی زیادہ ہے۔ اسی لئے ہمیں دیکھنے میں چاند اور سورج تقریباً برابر نظر آتے ہیں۔

جولائی کے مقابلے میں جنوری میں سورج زمین سے تیس لاکھ میل زیادہ قریب ہوتا ہے۔ یہ سمجھنا غلط ہے کہ گرمیوں میں زمین سورج کے قریب ہو جاتی ہے اور جاڑوں میں دور۔ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ گرمیوں میں زمین سورج سے زیادہ دور ہو جاتی ہے اور جاڑوں میں قریب گرمی سردی کا تعلق زمین کے جھکاؤ سے ہے۔ جب شمالی نصف کرہ میں گرمیوں کا موسم ہوتا ہے تو زمین کا اتنا حصّہ سورج کی طرف جھک جاتا ہے۔ اور اس پر سورج کی شعاعیں عمودی پڑتی ہیں اسی لئے ہمیں زیادہ گرمی محسوس ہوتی ہے — جاڑوں میں شمالی نصف کرہ سورج سے قریب تر ہونے کے باوجود پرے ہٹ جاتا ہے۔ اور اس پر سورج کی، شعاعیں ترچھی پڑتی ہیں۔ عمودی شعاعیں زیادہ گرمی لاتی ہیں اور ترچھی شعاعیں کم۔

کسی زمانے میں لوگ یہ سمجھتے تھے کہ سورج پگھلے ہوئے لوہے اور دوسرے اجزاء سے مل کر بنا ہے لیکن اب یہ پتہ چلا ہے کہ سورج میں تقریباً ۸۱ فیصد ہائڈروجن اور تقریباً ۱۸ فیصد ہیلیم گیس شامل ہے۔ بھاری عناصر صرف ایک فیصدی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ سورج آتشیں گیسوں کا ایک بہت بڑا گولا ہے۔

سورج کا قطر آٹھ لاکھ چھیاسٹھ ہزار میل ہے اس کے مرکز کا درجہ حرارت تقریباً دو کروڑ نوے لاکھ ڈگری فیرن ہائٹ سمجھا جاتا ہے۔ سورج کہکشاں کا ایک معمولی ستارہ ہے اور چھ لاکھ پچاس ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اس میں دوڑ رہا ہے ہماری زمین گرمی اور روشنی کی شکل میں سورج سے صرف تین منٹ تک جتنی قوت حاصل کرتی ہے اتنی قوت اس لاکھوں ٹن کوئلے سے بھی حاصل نہیں ہوتی جو پوری دنیا میں ایک سال میں پھونک دیا جاتا ہے

اگر ۱۶۵ پونڈ وزن کا ایک آدمی کسی صورت زمین سے سورج پر پہنچ جائے تو وہاں اس کا وزن چار ہزار چھ سو بیس پونڈ ہو جائے گا۔ کیونکہ سورج کی کشش زمین کے مقابلے میں ۲۸ گنا زیادہ ہے وزن کا تعلق کشش سے ہے اور کشش کا تعلق اس کے حجم سے ہے۔ بڑے جسم کی کشش زیادہ اور چھوٹے جسم کی کشش کم ہوتی ہے چاند زمین سے بہت چھوٹا ہے اس لئے اسکی کشش زمین کی کشش کے مقابلے میں صرف چھٹا حصّہ ہے۔

جوہر سعیدی

قوتِ پرواز بھی ہوتی ہے پروازوں سے کم
آشنا ہیں لوگ اِس بستی کے اِن رازوں سے کم

جی بہل جاتا ہے ہنگاموں میں دار و گیر کے
شور اس نگری کا ہو جاتا ہے آوازوں سے کم

زندگی کو زندگی کی بے یقینی کھا گئی
ہو گیا سوزِ یقیں بے جان آوازوں سے کم

آپ کے لطفِ مسلسل کی قسم کھاتا ہوں میں
مہرباں ہیں آپ مجھ پر میرے اندازوں سے کم

اُن کو آئینہ دکھا کر کیا کرے گی زندگی
سرخیاں گالوں کی جو کر لیتے ہیں غازوں سے کم

لب کشائی پر انھیں مجبور کیوں کرتے ہیں لوگ
دلکشی میں ہے سکوتِ ناز کیا سازوں سے کم

سرد مہری کا زمانے کی گلہ کیا کیجئے
کھیلتے ہیں انکے جلوے بھی نظر بازوں سے کم

زندگی ہے کوچۂ دار و رسن میں آج بھی
تیری حیرت سے زیادہ میرے اندازوں سے کم

سادگی کے حسن کا جادو کہو یا بے حسی
رابطہ جوہر نے رکھا ہے سخن سازوں سے کم



راشد علی



خوشی کے دیپ

سورج غروب ہو رہا تھا۔ دھیرے دھیرے رات کی تاریکی زمین و آسمان کو اپنے دامن میں سمیٹ رہی تھی۔ رشدی اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا اس کے سامنے کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور باغیچہ کا کچھ حصّہ اسکی نظروں کے سامنے تھا۔ اسکی تمام حرکات ایک خائف قیدی کی طرح تھیں۔ یہ بڑے بڑے کمرے یہ وسیع برآمدہ یہ روشن دان۔ یہ ریشمی پردے۔ اس کے ہاتھ کی بنائی ہوئی خوش رنگ تصویریں، وہ سوچ رہا تھا۔ آخر یہ سب کس کے لئے ہیں۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی کیونکہ باہر اندھیرا بڑھ رہا تھا اور اندر اسکی روح پر ایک نیم غنودگی کا عالم طاری تھا۔ ایک دردناک سناٹا اسکی رگ و پے میں سمایا ہوا تھا۔ وہ کرسی سے اٹھا اور آہستہ آہستہ چل کر دیوار کے قریب گیا۔ بجلی کے بٹن کو حرکت دی کمرہ روشنی سے منوّر ہوگیا۔ مگر دل کے اندھیرے کو کون دور کرے گا۔ اسکی بے قرار روح اس قدر روشنی کے باوجود تڑپ رہی تھی ایک عجیب قسم کی یاسیت اور بے حسی اسکی رگوں میں سمائی ہوئی تھی۔ نہ جانے یہ کیسی زندگی تھی جو اسکی روح میں ویرانگی اور افسردگی کا سمندر لے آئی۔ حالانکہ اسے دولت عزت، شہرت اور سبھی کچھ میسّر تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسکی زندگی میں کوئی کشش نہیں ہے یہ حسین دنیا اس کے لئے ویران ہے۔ وہ محبت کا بھوکا ہے۔ وہ صرف پیار کا متمنّی ہے۔ اس پیار کا جو ایک مرد کو صرف ایک عورت ہی دے سکتی ہے۔ لیکن وہ بدنصیب تھا۔ دنیا کی ہر عورت اس سے نفرت کرتی تھی کوئی بھی اسے پیار کرنے کے قابل نہیں سمجھتی تھی۔ یوں اس، لئے تھا کہ وہ انتہائی بدصورت تھا۔ اس کے پاس ظاہری حسن نہ تھا کیا کچھ علاج نہ کیا اس نے اپنی اس نفرت انگیز بدصورتی کو دور کرنے کے لئے۔ لیکن کوئی بھی ڈاکٹر اسکی بدصورتی کو جو اس کا مقدر بن چکی تھی دور نہ کر سکا۔

آرٹ گیلری صاحب ذوق حضرات و خواتین سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ رشدی اور اسکا دوست جاوید بھی ایک طرف کرسیوں پر دراز تھے۔ اس مرتبہ رشدی کی بنائی ہوئی تصویر کو سب سے بہترین قرار دیا گیا اور اپنے شاہکار پر اسے اول انعام دیا جانے والا تھا مشتاقانِ دید کا اصرار تھا کہ اس تصویر کے خالق کو اسٹیج پر لایا جائے۔ مگر رشدی نہ جانے کیوں سب کے سامنے جاتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ آرٹ گیلری میں بیٹھے ہوئے سبھی لوگوں کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ حاضرین رشدی کو دیکھنے کے لئے بیتاب تھے۔ اسے دیکھنے کے لئے اگلی صفوں میں بیٹھی ہوئی عورتیں آپس میں چہ میگوئیاں کر رہی تھیں آخر جاوید کے بے حد اصرار پر رشدی اسٹیج پر جانے کے لئے رضامند ہوگیا۔ فوراً ہی اعلان نشر کیا گیا کہ ملک کے مایۂ ناز مصوّر رشدی اسٹیج پر تشریف لا رہے ہیں۔ یہ اعلان سنتے ہی تمام حاضرین کی نظریں اسٹیج پر جا لگیں۔ رشدی اپنی جگہ سے اٹھا اور آہستہ آہستہ اسٹیج کی طرف بڑھنے لگا۔ لوگوں کے چہرے بشاش تھے۔ عورتوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ لیکن جونہی وہ اسٹیج پر پہنچا لوگوں کے چہروں پر جیسے افسردگی چھا گئی۔ عورتیں رشدی کو دیکھ کر جھجکی نہیں بلکہ جیسے اچانک ڈر گئی ہوں۔ رشدی کو دیکھ کر ان کے چہروں پر کراہت اور گھن کے تاثرات پیدا ہوئے۔ کچھ نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اور آگے بیٹھی ہوئی کچھ عورتیں اسکی بدصورتی پر افسوس کا اظہار کرنے لگیں۔

"تصویر کتنی خوبصورت لیکن خود بے چارے کا چہرہ"۔

"انگلیوں میں تو جادو ہے۔ لیکن بدنصیب کی شکل"۔

یہ منظر دیکھ کر رشدی کا دماغ جھنجھنا اٹھا۔ اس کے کان سن ہو گئے تھے۔ وہ اپنے آپ کو گرتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ آرٹ گیلری کی چھت اس کے اوپر گر گئی ہے جیسے اس پر کسی نے گھڑوں پانی ڈال دیا ہو وہ زیادہ دیر اس منظر کی تاب نہ لا سکا۔ وہ اپنے دوست کو ساتھ لئے بغیر دبے پاؤں چوروں کی طرح ہال سے باہر نکل گیا۔ اس وقت اس کے خیالات کی دنیا میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ کاش وہ اس دنیائے رنگ و بو میں پیدا ہی نہ ہوا ہوتا۔ کیا دیا اسے زندگی نے۔ نفرتوں کے علاوہ اور کچھ بھی تو نہیں۔ حقیقی خوشی اس سے کوسوں دور تھی کتنا اچھا ہوتا کہ اس کے ماں باپ پیدائش کے وقت اس کی صورت دیکھتے ہی اسے گلا گھونٹ کر مار ڈالتے۔ کتنا منحوس اور بدقسمت تھا وہ کہ پیدا ہوتے ہی اپنی ماں کو کھا گیا۔ ذرا بڑا

ہوا تو باپ نے بھی منہ موڑ لیا اور اب جبکہ وہ جوان ہو چکا ہے تو بچپن سے لے کر اب تک وہ ان نفرتوں کا مقابلہ کرتا آ رہا ہے جو اسکو دیکھتے ہی لوگوں کے چہروں سے عیاں ہونے لگتی ہے۔ اور اسی لئے وہ آج بھری محفل سے اٹھ کر چلا آیا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اب کہاں جائے بے اختیار اسکے قدم ریلوے اسٹیشن کی طرف بڑھنے لگے شاید وہ اس شہر کو ہی چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ وہ سکون کا متلاشی ہے ہاں کچھ عرصہ کے لئے وہ کسی گاؤں میں چلا جائے گا۔ ممکن ہے وہاں رہ کر یہ روح فرسا واقعہ بھول جائے۔

اسٹیشن پر ٹرین تیار کھڑی تھی۔ ٹکٹ لے کر وہ انٹر کے ڈبے میں داخل ہوا۔ اس نے گرد و پیش پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ دروازے کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ کے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ کچھ وقفہ کے بعد گاڑی آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔ اسکی نگاہیں کسی گاؤں کو ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کرنے لگیں۔ گاڑی اب سرد ہوا کو چیرتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اور اسکی مضطرب آنکھوں میں اور زیادہ بے چینی پھیلتی گئی۔ اس نے دور کسی رہٹ کے چلنے کی آواز سنی جسمیں بیلوں کی گھنٹیوں کی مترنم آوازیں یوں ملی ہوئی تھیں جیسے فضا میں جلترنگ سی بج رہی ہو۔ وہ اپنا سر اوپر اٹھا کر دور تک گھورنے لگا۔

کتنا سکون ہے ان بستیوں میں۔ نہ یہاں شور ہے نہ ہنگامے۔ نہ یہاں بناوٹ ہے اور نہ فریب۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں چپکے سے شامیں نیلے آسمان کے قدموں میں سفید سفید پھول بکھیر کر رات کو مل کر گیت گانے لگتی ہیں اور راتیں کسی کو بتلائے بغیر اپنی سیاہ۔ نمناک زلفیں فضا کے دوش پر لہرا دیتی ہیں اور صبح تک ان زلفوں سے شہد ٹپکتا رہتا ہے اور پھر شہد بکھیر کر رات کہیں کھو جاتی ہے۔ اور شاداب سویرے سانس لیتے ہوئے جاگ پڑتے ہیں۔ یہ چکر یونہی چلتا رہتا ہے۔

ٹرین کی رفتار تیز ہو گئی تھی سرد ہوا کے تھپیڑے بڑھ گئے تھے اور اسکے تخیل کے تمام دیپ بجھ گئے۔ اس نے دیکھا اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر شخص بڑے اطمینان سے بیٹھا اخبار کا مطالعہ کر رہا ہے اور اس کے عین سامنے والی نشست پر دو نوجوان لڑکیاں بیٹھی ہوئی ہیں وہ ان لڑکیوں کو ساتھ دیکھ کر کچھ گھبرا سا گیا۔ اور اسکی نگاہ کے سہمے ہوئے اجالے ڈبے میں بھٹکنے لگے۔ اسے آرٹ گیلری کا منظر یاد آنے لگا۔ اس نے اپنا منہ ان لڑکیوں کی طرف سے پھیر لیا۔ اسے یقین تھا کہ اگر انھوں نے اسکی طرف دیکھ لیا تو وہ اسکی بدصورتی سے سہم جائیں گی۔ وہ کافی دیر تک اسی طرح بیٹھا رہا۔ آخر اس کے قریب بیٹھے ہوئے شخص نے رشدی کو مخاطب کیا۔

"آپ چپ کیوں ہیں کچھ باتیں کیجئے تاکہ وقت کٹے"

رشدی کو مجبوراً اپنا رخ بدلنا پڑا۔ اس نے دیکھا کہ سامنے بیٹھی ہوئی لڑکیوں میں سے ایک جس کا رنگ سانولا تھا اور دیکھنے میں دوسری سے بڑی معلوم ہوتی تھی اسے دیکھ کر کچھ جھجک سی گئی ہے اور پھر اس نے اپنا منہ نفرت سے دوسری طرف پھیر لیا ہے۔ لیکن رشدی کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ دوسری لڑکی جو اس سے زیادہ خوبصورت اور کم عمر بھی ہے اسکی طرف ٹکٹکی باندھے مسلسل اپنے سرخ ہونٹوں پر تبسم کی ضیائیں بکھیر رہی ہے۔ رشدی کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی سہانا خواب دیکھ رہا ہو۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک خوبصورت لڑکی اسے دیکھ کر اس قدر دلکشی سے مسکرا سکتی ہے۔ لڑکیاں تو عموماً اس کا بدصورت چہرہ دیکھ کر ڈر سی جایا کرتی تھیں۔ رشدی نے اپنے اس شک کو دور کرنے کے لئے کہ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا کئی بار لڑکی کی طرف دیکھا مگر وہ بدستور اسے دیکھے جا رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا عجیب بات ہے کہ حسین لڑکی مجھے دیکھ کر ڈری نہیں۔

وہ سوچنے لگا "کیا میں اب بدصورت نہیں رہا"

اور اس نے غیر ارادی طور پر اپنا ہاتھ اپنے چہرہ پر پھیرا مگر چہرے کے خد و خال بتا رہے تھے کہ اس کے چہرے کی بدصورتی میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

اس نے لڑکی کی طرف پھر دیکھا۔ وہ خوبصورت لڑکی مسلسل اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ اس کے منجمد ہونٹوں میں بھی ایک ہلکی سی جنبش پیدا ہوئی اور اس نے بھی اپنے لبوں پر مسکراہٹ بکھیرنے کی کوشش کی لیکن اس کے لبوں میں صرف لرزش سی پیدا ہو کر رہ گئی۔ اس نے اپنی جیب سے سگرٹ کا پیکٹ نکالا اور قریب بیٹھے ہوئے ادھیڑ آدمی کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

"شوق فرمایئے"

وہ آدمی چونکا اور اسکی طرف دیکھ کر بولا۔

"شکریہ میں سگرٹ نہیں پیتا"

رشدی سگرٹ جلا کر اس خوبصورت لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ جس کی مسکراہٹیں بدستور اس کے یاقوتی لبوں پر رقص کر رہی تھیں اور سانولی لڑکی کے چہرے پر نفرت کے آثار اب بھی نمایاں تھے۔ اس نے سگرٹ کا طویل کش لیتے ہوئے قریب بیٹھے ہوئے شخص سے پوچھا۔

"آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟"

"ہم سورن پور جا رہے ہیں۔ اور آپ؟"

اس آدمی نے اخبار پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے اس سے بھی سوال کر ڈالا۔

"جی دراصل میں شہر کے ہنگاموں سے تنگ آ کر کچھ دن کسی پرسکون گاؤں میں گزارنا چاہتا ہوں لیکن میں نے ابھی یہ فیصلہ نہیں کیا ہے کہ میں کس گاؤں میں ٹھہروں گا" رشدی نے جواب دیا۔

"عجیب بات ہے۔ آپکو اپنی منزل کا ہی پتہ نہیں اور ہاں صاحب اتنا تو ہمیں بھی تجربہ ہوا ہے کہ حقیقی مسرت شہر میں مفقود ہے۔ میری یہ دونوں لڑکیاں بھی بہت جلد شہر کے ہنگاموں سے اکتا جاتی ہیں"

اس آدمی نے ان دونوں لڑکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جس میں سے سانولی لڑکی اونگھ رہی تھی اور خوبصورت لڑکی بیٹھی متواتر اسکو تکے جا رہی تھی۔

رشدی پچھلے تمام واقعات بھول چکا تھا۔ اس وقت اسکی تمام تر توجہ اس لڑکی کی طرف تھی جو اسے دیکھ دیکھ کر بڑی پیاری مسکراہٹ مسکرا رہی تھی۔ رشدی اس وقت اپنے آپ کو دنیا کا خوبصورت انسان محسوس کر رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اسے حقیقی مسرت کا احساس ہوا تھا۔

اس کے قریب بیٹھا ہوا شخص خلاء میں گھور رہا تھا کچھ دیر بعد اس نے چونک کر کہا۔

"تو ہاں آپ کسی گاؤں میں جائیں گے اور یقیناً وہاں رہنے کے لئے آپ کو کوئی سرائے ڈھونڈنا پڑے گی اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو کچھ عرصہ کے لئے ہمارے گھر چلکر رہ سکتے ہیں۔

"جی ——!"

"ہاں سورن پور اچھا گاؤں ہے۔ آپ کو وہاں بہت سکون ملے گا"

اسوقت رشدی کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

قدرت اچانک کتنی مہربان ہو رہی ہے۔ کہ وہ خود اس خوبصورت لڑکی کے قریب رہنے کا انتظام کر رہی ہے۔ رشدی نے اپنی اس بے پناہ خوشی کو چھپاتے ہوئے اس آدمی سے کہا۔

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ہاں آپکو کوئی تکلیف نہ ہو"

"میری تکلیف کی پرواہ نہ کیجئے۔ میری دونوں لڑکیاں بھی زندہ دل ہیں" اس آدمی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

رشدی نے اسکے یہاں ٹھہرنے کی حامی بھر لی۔

ٹرین چلتے چلتے آہستہ ہوئی اور پھر ایک دھچکے کے ساتھ رک گئی۔ یہ سورن پور کا اسٹیشن تھا۔

"اتریئے ——"

اس آدمی نے رشدی سے کہا اور جلدی جلدی اپنا سامان نیچے اتار لیا۔ پلیٹ فارم سے باہر آ کر اس نے ایک بیل گاڑی کرایہ پر لی۔ چاروں اس پر سوار ہو گئے۔ راستے بھر وہ آدمی رشدی کو گاؤں کے پرفضا مقامات دکھاتا رہا۔ رشدی کو بھی یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کسی نئی دنیا میں آ گیا ہے۔ بیل گاڑی کھیتوں کے کنارے اگے ہوئے گرانڈیل اور تناور درختوں کے درمیان سے گزر رہی تھی سرسراتی ہوئی شباب آور ہوا کے جھونکے چل رہے تھے۔

رشدی نے کن انکھیوں سے چھوٹی لڑکی کو دیکھا اس کے چہرہ پر اب پہلے سے زیادہ بشاشت تھی۔ لیکن سانولی، لڑکی کے چہرے پر بدستور نفرت کے آثار نمایاں تھے رشدی کو آج عجیب سا محسوس ہو رہا تھا اسکی زندگی کی خشک طویل

رات میں یہ حسین لڑکی حقیقی مسرت کی کرن بنکر نمودار ہو گئی تھی وہ نہ جانے کس خیال میں گم تھا کہ اچانک بیل گاڑی رک گئی۔ اس آدمی نے کہا۔

"اتریئے غریب خانہ آگیا۔"

رشدی کے جسم میں جھرجھری سی دوڑ گئی وہ اچک کر گاڑی سے نیچے اترا۔ اس آدمی نے آگے بڑھ کر گھر کے دروازہ کا قفل کھولا۔ سب سے پہلے وہ دونوں لڑکیاں اندر داخل ہوئیں پھر آدمی نے رشدی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"آپ بھی اندر تشریف لے چلیئے۔"

رشدی اور آدمی دونوں آہستہ آہستہ دروازے سے مکان کے اندر داخل ہوئے۔ وہ آدمی رشدی کو مکان کے ایک کمرے میں لے گیا۔ وہاں ایک پلنگ دو تین کرسیاں اور ایک چھوٹی سی میز پڑی تھی۔ اس آدمی نے پلنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رشدی سے کہا۔

"کچھ دیر آرام کر لیجئے۔ آپ تھک گئے ہونگے"

پھر اس نے آواز دی۔

"بیٹی بلّو۔"

آواز دینے کے ساتھ ہی وہی چھوٹی لڑکی جس نے اب اپنے کپڑے تبدیل کر لئے تھے کمرے میں آئی آدمی نے اس سے کہا۔ "دیکھو بیٹی مہمان کے لئے کچھ کھانے پینے کا انتظام کرو۔ اور اگر اس وقت پڑوس میں تازہ دودھ مل جائے تو ٹھیک ہے۔ اس کے پینے سے انکی تکان دور ہو جائے گی۔"

"لڑکی مسکرا کر واپس چلی گئی اور وہ آدمی بھی یہ کہکر چلا گیا کہ "آپ کچھ دیر آرام کریں ہم جب تک آپ کے کھانے پینے کا بندوبست کرتے ہیں۔"

رشدی خیالات کی دنیا میں کھویا ہوا تھا کہ یہ لوگ کتنے اچھے ہیں اور وہ لڑکی ــ بلّو۔

وہ ابھی یہ کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ لڑکی ایک گلاس میں دودھ لے کر آ گئی اور بڑی معصومیت سے گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"یہ لیجئے۔"

"اسکی کیا ضرورت تھی۔" رشدی نے تکلفاً کہا۔

"بیٹی بلّو۔" اس آدمی کی آواز آئی۔

لڑکی کمرے سے باہر چلی گئی۔ رشدی نے تازہ دودھ سے بھرا ہوا گلاس منہ سے لگا لیا۔ اور خالی گلاس قریب ہی رکھی ہوئی میز کے اوپر رکھ دیا کچھ دیر بعد وہ لڑکی مسکراتی ہوئی پھر آئی۔ بولی۔

"دودھ پی لیا آپ نے؟"

"جی۔"

اور جب اس لڑکی نے دودھ کا خالی گلاس میز پر سے اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اس کے تصورات کا حسین محل دھڑام سے نیچے آ رہا۔ اور خوشی کے دیپ بجھ گئے۔ گلاس کو ٹٹولتے ہوئے لڑکی کے ہاتھ نے بتا دیا تھا کہ وہ اندھی ہے۔



اقبال ندیم

"شکستِ مرگ"

موت اک دیو کے قالب میں اتر کر اک شب
خواب میں آدمِ خاکی کو ڈرانے آئی
قفسِ جسم سے پنچھی کو اڑانے آئی
ایک سوئے ہوئے جادو کو جگانے آئی

زیست کے سادہ و معصوم لبوں سے یکلخت
قہقہے نکلے تو افلاک سے ٹکرانے لگے
آتشیں پھول جو بادل تھے وہ برسانے لگے
ہر طرف رنگ طلسمات نظر آنے لگے

زیست اور موت پھر آمادۂ پیکار ہوئے
اور یہ جنگِ گل و سنگ بہت دیر رہی
سرِ دفیں اپنی لہو رنگ بہت دیر رہی
زیست اور موت کی یہ جنگ بہت دیر رہی

انجم و ماہ نے جاگے ہوئے انسانوں نے
پائے ہستی پہ سرِ مرگ کو خم دیکھا ہے
زیست کے ہاتھوں میں نصرت کا علم دیکھا ہے
اب بھی دنیا نے جو دیکھا ہے وہ کم دیکھا ہے

فرید عشرتی

نشانِ منزلِ ہستی وہیں سے ابھرا ہے
جہاں سے قافلہ اہلِ جنوں کا گذرا ہے

شبِ فراق تخیل کی شاہراہوں سے
ترا خیال بھی دامن بچا کے گذرا ہے

مری نگاہ کی تابانیوں کے شعلوں سے
کسی کے عارضِ گلگوں کا رنگ نکھرا ہے

بغیر تذکرہ حسنِ گلرخاں بے سود
فلک سے کوئی صحیفہ اگرچہ اترا ہے

یہ انجمن ہے نگارانِ فتنہ ساماں کی
وہ لٹ گیا جو یہاں ایک رات ٹھہرا ہے

دلوں کے سوزِ دروں کی شعاعِ اول سے
رخِ حیات پہ نورِ حیات بکھرا ہے

کسی کی گلیوں سے ابتک صدائیں آتی ہیں
فرید سا کوئی شاعر ادھر سے گذرا ہے

ش۔ ید الٰہی

ابو محمد

اندلس کے شہر قرطبہ میں ابو محمد علی ابن حزم ۳۸۴ ہجری ماہ رمضان کی آخری تاریخوں میں پیدا ہوئے ۷۳ سال عمر پاکر ۴۵۶ ہجری میں واصل بحق ہو گئے

مغربی اسلامی دنیا میں ابو محمد کو مجتہد اور مجدد کا مرتبہ حاصل ہے ۔ آپ محدث، فقیہہ، عالم ہونے کے ساتھ زاہد اور متقی تھے ۔ مختلف علوم پر ابو محمد کی تصانیف ملتی ہیں انکی تعداد کثیر ہے ۔ بہت بڑی تعداد منظر عام پر نہ آسکی کہتے ہیں کہ ان کے فرزند کو ترکہ میں چار سو جلدیں ان کی تصانیف کی ملتی تھیں اور ان کے صفحات ایک لاکھ ساٹھ ہزار کے قریب تھے ۔

ابو محمد کی تصانیف میں "کتاب الملل والنحل" نہایت معرکتہ الآرا کتاب ہے جسکا اردو ترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے دارالترجمہ نے اہتمام سے شائع کیا ہے ۔ دوسری اہم تصنیف "محلیٰ" ہے اس کتاب میں مسلمانوں کے اموال میں زکوٰۃ کے علاوہ مالی واجبات اور حقوق سے بطور خاص بحث کی گئی ہے ۔ محلیٰ کے مباحث سے چوتھی صدی ہجری میں مسلم قوم کے معاشی مسائل، سرمایہ کی تقسیم اور اس کے اثرات، عوام کا انداز فکر اور علمار کا صاحبان ثروت و اقتدار کی حمایت کرنا اور قرآن کے احکام سے غلط نتائج برآمد کر کے مالداروں کے مال کی حفاظت اور فاقہ کش عوام کو اپنی حالت پر قانع رہنے اور مفلس کو خدا کی جانب سے رحمت اور آزمائش بتلانا ۔ عوام کی کشمکش اور افلاس کے ہاتھوں انکی زبوں حالی کا بھی اندازہ ہوتا ہے ۔

اس مضمون میں ابو محمد کی اس ایک بحث کو پیش کیا جاتا ہے جو اپنی جگہ اجتہاد کا درجہ رکھتی ہے ۔ ضرورت ہے کہ ہم چوتھی صدی کے اس مفکر کے خیالات کو سامنے رکھ کر اسلامی نظام معیشت اور تقسیم دولت کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کریں ۔ دنیا دار علمار اور ملوکیت کے زرخرید سرمایہ دار کے حمایتی مولویوں کا محاسبہ کریں ۔

ابو محمد فرماتے ہیں :۔

"اگر زکوٰۃ اور خراج کی آمدنی مسلم معاشرے کے حاجتمندوں کی احتیاج پوری نہ کرسکیں اور وہ کافی نہ ہوں تو امام یا حاکم اس معاشرہ کے مالداروں کو مجبور کرسکتا ہے کہ وہ حاجتمندوں کی احتیاج پوری کریں ابو محمد نے احتیاج اصلیہ کی وضاحت اس طرح کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہر فرد کو حسب ذیل تین چیزیں لازماً ملنی چاہئیں ۔

۱ :۔ ایسا لباس جو ستر پوشی کرسکے اور گرمی سردی کے اثرات سے بھی محفوظ رہ سکے ۔

ابو محمد اپنی اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے چند، احادیث اور نقلیات، روایات بھی بیان کرتے ہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں :۔

بسلسلہ سند ابو سعید خدری یہ حدیث بیان کی ہے

"فرمایا نبی کریم نے جس کسی کے پاس زائد سواری کا سامان ہو اسے چاہیئے کہ وہ زائد سواری اس بھائی کو دیدے جس کے پاس سواری نہ ہو ۔ جس کے پاس کھانے پینے کا سامان اسکی اپنی ضرورت سے زائد ہو وہ زائد سامان ایسے فرد کو دیدے جس کے پاس کھانے کو نہ ہو ۔ ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اقسام کے اموال کو گنانا شروع فرما دیا یہاں تک کہ ہم نے یقین کر لیا کہ حاجت اصلیہ سے زائد کسی شے پر ہمارا حق نہیں ہے ۔

ابو محمد فرماتے ہیں کہ جو بات ابو سعید خدری نے بیان کی ہے اس بات پر تمام صحابہ کا اجتماع ہے (مخفی مبادکہ اجتماع کا انکار کفر ہے) عبدالرحمٰن بن مہدی سے ایک روائت بیان کرتے ہیں ۔

"فرمایا حضرت عمر نے جو بات مجھے اب معلوم ہوئی ہے اگر پہلے معلوم ہوتی تو میں مالداروں سے ان کا فاضل مال چھین کر اسے ناداروں اور مہاجروں میں تقسیم کر دیتا"

سعید بن منصور اس سلسلہ میں ایک روایت بیان کرتے ہیں ۔

"حضرت علی کرم اللہ وجہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے مالداروں کے مال میں سے اس قدر مال لازماً حاصل کرنا فرض گردانا ہے جو اس جماعت کے ناداروں کی، کفالت کرسکے ۔ اگر اس جماعت کے افراد نادار ننگے بھوکے ہوں یا کسی اور قسم کی تنگی میں مبتلا ہوں ۔ تو یہ بات مالداروں کے مال کو روک رکھنے کی بنا پر ہوگی ایسی صورت پر اللہ تعالےٰ پر یہ بات لازم ہوگی کہ وہ مالداروں کے اس عمل کا محاسبہ فرمائے اور ان کو عذاب میں مبتلا فرمائے ۔"

ابن حزم اسی انداز پر اس مقالہ میں، روایات احادیث اور قرآن پاک کی واضح آیات پیش کرتے جاتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ وہ مسلمان کے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ اور بھی مالی حقوق ہیں مسلم حکومت لازم ہے کہ کفالت عام اور رفاہ عامہ کے کاموں کے لئے معیار زندگی بلند کرنے کے لئے، روزگار فراہم کرنے کے لئے، بیماروں کی طبی امداد، یتیموں کی پرورش اپاہجوں کی نگہداشت کے لئے دولت مندوں کی دولت حاصل کرے اور ضرورتاً جبریہ طور پر چھین بھی لے ۔

ابو محمد ابن حزم لکھتے ہیں کہ مشہور تابعی، شعبی، مجاہد اور طاوس بھی اس بات کے قائل تھے کہ "فی المال حق سوی الذکوٰۃ" ہمارے موجودہ دور کے علمار زکوٰۃ کے علاوہ کسی مالی ذمہ داری کو تسلیم نہیں کرتے وہ صرف صدقات اور خیرات کے ذریعہ معاشرہ کی مانگ پوری کرنا چاہتے ہیں بھیک دیکر بری الذمہ ہونا چاہتے ہیں ۔ حالانکہ کفالت عامہ مسلم سماج پر لازم ہے ناداروں کی کفالت فرض ہے اور صدقات و خیرات مستحب چاہے کوئی انھیں اختیار کرے چاہے نہ کرے ۔

امام ابو محمد اس بحث کو ختم کرتے ہو لکھتے ہیں اور ایک نیا اندازِ فکر پیش کرتے ہیں جو توجہ اور غور کا محتاج ہے ۔

"ہمارے علمار فرماتے ہیں کہ جو شخص پیاسا ہو اور پیاس سے اس کی جان جانے کا خطرہ لاحق ہو تو اس پیاسے پر لازم ہے کہ اپنی جان بچانے کی خاطر جہاں سے اور جس طرح بھی پانی حاصل ہوسکے پانی حاصل کرے اور جان بچائے اگر جستجو میں کسی سے اس کو جنگ کرنی پڑے تو اس سے بھی دریغ نہ کرے ۔ کیونکہ جان بچانا فرض ہے اس بات کو سامنے رکھ کر غور فرمائیے کہ ہمارے علمار ایک فرد کو پانی کی پیاس سے واقع ہونے والی موت سے نجات حاصل کرنے، کشمکش، مقابلہ اور جنگ کی اجازت دیتے ہیں اور اسی فرد کو بھوک، عریانی، بیماری اور دیگر احتیاجات کے سلسلہ میں موت کے خوف سے

بچنے کے لئے کشمکش مقابلہ اور جنگ کی اجازت نہیں دیتے یہ بات صریحاً قیاس اجتماع اور سنت کے منافی ہے۔"

اس بحث کو مکمل کرتے ہوئے ابن حزم لکھتے ہیں :۔

"یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ایک فرد کے پاس خورد و نوش کے سامان کی فراوانی ہے اور دوسرا فرد قوم بھوک کی شدت سے بے حال ہوا جا رہا ہے اندیشہ ہے کہ وہ ہلاک ہو جائے اس بے حال بھوکے شخص کو ہمارے علماء مشورہ دیتے ہیں کہ وہ مرا ہوا جانور خون یا سور کا گوشت کھا کر اپنی جان بچائے میں کہتا ہوں اس بھوکے کو یہ حق حاصل ہے کہ مالدار ذخیرہ باز کے مال سے حسب ضرورت چھین لے اور اپنی جان عزیز بچائے خواہ یہ مال و اسباب کسی مسلمان فرد کا ہو یا کافر کا۔"

ابو محمد اس اپنی رائے یا اجتہاد کو مکمل فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اس کشمکش میں اگر ضرورتمند زخمی ہو جائے یا مارا جائے تو مزاحم سرمایہ دار ذخیرہ باز سے قصاص لیا جائے گا۔ اور اگر مالدار غاصب مارا جائے تو اللہ کی لعنت کا حق دار ہو گا یہ بات اس لئے کہ اس غاصب ذخیرہ باز نے ضرورت عامہ کی اشیاء کو روکا، ذخیرہ کیا اور دوسروں کو محروم کر دیا۔ اس نے احکام الٰہی کی صاف نافرمانی کی اور بغاوت کا مرتکب ہوا۔ باغی فرد یا جماعت سے جنگ کرنا اور انھیں احکام الٰہی کا پابند کرنا مسلم عوام کا فرض ہے بفرمان فرقان۔

"اگر ایک فریق دوسرے فریق پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ احکام الٰہی کے پابند ہو جائیں۔

اقبال ردولوی

غزل

اوروں کا ہے گمان پشیماں رہے ہیں ہم !
اے دوست جرمِ عشق پہ نازاں رہے ہیں ہم !

پوچھا مزاج گردشِ دوراں نے بار ہا !
پھر بھی اسیر گیسوئے جاناں رہے ہیں ہم

سمجھے اگر نہ کوئی ہماری خطا نہیں
ورنہ لباسِ شعر میں عریاں رہے ہیں ہم

شاہد ہے اسکی گردشِ لیل و نہار بھی
تجھ سے بچھڑ کے کتنے پریشاں رہے ہیں ہم

گذری تمام عمر یقیناً بتوں کے ساتھ
اقبالؔ پھر بھی صاحب ایماں رہے ہیں ہم



رحمت اللہ صدیقی

اُنکے نام

پھر غمِ دوست غمِ زیست سے آساں ہوگا
پھر محبت مرے ہر گیت کا عنواں ہوگا

پھر بہار آئے گی ساقی ترے میخانے میں
پھر تری بزم میں اک جشنِ چراغاں ہوگا
مسکرا اٹھیں گے پھر پھول
صورت لالہ ...

... ب صاحب
... جلسے پر تقریر شروع
... ن عظیم الشان منصوبے
... صاحب اس حد تک متاثر ہوئے
... ری نے سوال پوچھا کہ اتنے بڑے جلسے اور
... سیم کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا۔؟

جناب آصف صدیقی صاحب نے جواب دیا کہ ہمیں ہماری ضرورت سے بھی زیادہ رقم خود سرمایہ دار مہیا کریں گے۔ ٹریڈ یونین کارکن کی حیثیت سے ہم جانتے ہیں کہ سرمایہ داروں میں آپس میں اختلاف ہوتا ہے۔ چونکہ ہمارے پاس ووٹرز کی بہت بڑی تعداد ہوگی اس لئے ہم سرمایہ داروں کے اس آپس کے اختلاف سے فائدہ اٹھائیں گے۔ ہم اس سرمایہ دار سے بھی روپیہ لیں گے جو خود کامیاب ہونا یا کسی کو کامیاب کرانا چاہتا ہو اور اس سرمایہ دار سے بھی جو انھیں ناکام بنانا چاہتا ہو۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہ رضاکارانہ پیشکش کی کہ وہ اپنے وسائل سے کام لے کر پورے ملک میں پارٹی کی شاخیں قائم کریں گے۔ منصوبہ اتنا مکمل اور جامع تھا کہ شاید اس پر فوری عمل شروع ہو جاتا لیکن کونسل کے ایک کم سمجھ ممبر نے فیڈریشن کے حسابات کا سوال اٹھایا اور اس طرح بات دوسری طرف نکل گئی۔ افسوس کہ لیبر پارٹی زندہ باد کا نعرہ تک نہ لگ سکا۔

... زیادہ
... راور مفکر
... ئے پر جماعت
... ہیں جتنی بھی
... سب کی سب
... ضروری ہے۔
... کو کامیاب بنانے
... کا بھی اعلان کیا
... ایک ذمہ دار
... چیت مکمل کر چکے
... بہت دلچسپی لے
... ساتھ وعدہ کیا ہے کہ وہ
... لئے اپنے تمام اراکین کو
پندرہ روپئے فی ٹرک کے
بچا دیں گے۔ آصف صاحب

اسٹیٹ بنک یونین کی شاندار کامیابی

انتظامیہ نے درجہ سوم کے ملازمین کے مطالبات تسلیم کر لئے

کراچی (نمائندہ منشور) تقریباً ایک ماہ کے مسلسل اور موثر احتجاج اور مکمل اتحاد کے مظاہرے کے بعد اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی انتظامیہ ملازمین درجہ سوم کے مطالبات تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئی۔

اس تنازعے کی تفصیلات یہ ہیں کہ درجہ سوم کے ملازمین کی یونین نے ۲۵ مارچ ۱۹۶۳ء کو ایک اسٹرائیک نوٹس دیا اور چند مطالبات پیش کئے۔ اور دوبارہ ۱۲ نومبر ۱۹۶۴ء کو دوسرا اسٹرائیک نوٹس دیا۔ اس دوران یونین نے انتظامیہ کو اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کی کہ چونکہ اشیاء صرف کی قیمتوں میں اضافے اور حکومت کے دوسرے اداروں میں چند اہم تبدیلیوں کی وجہ سے حالات میں اہم تبدیلی آگئی ہے اس لئے ۲۶ مئی ۱۹۶۴ء کے معاہدے کے مطابق انتظامیہ کو یونین کے معقول مطالبات تسلیم تصنیف" تھی۔ یونین بڑے ضبط و تحمل کے ساتھ انتظامیہ زکوٰۃ کے علاوہ مالی وادیہ اختیار کئے جانے کا انتظار کرتی کی گئی ہے۔ محلی کے مباعث رہو کر نومبر کے آخر میں احتجاجی مسلم قوم کے معاشی مسائل، نسرمایہ کے بعد انتظامیہ نے اثرات، عوام کا انداز فکر اور علماء کا صاحبان ثروت کا بمین اقتدار کی حمایت کرنا اور قرآن کے احکام سے غلط نتائج برآمد کر کے مالداروں کے مال کی حفاظت اور فاقہ کش عوام کو اپنی حالت پر قانع رہنے اور مفلس کو خدا کی جانب سے رحمت اور آزمائش بتلانا۔ عوام کی کشمکش اور افلاس کے ہاتھوں انکی زبوں حالی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

اس مضمون میں ابو محمد کی اس ایک بحث کو پیش کیا جاتا ہے جو اپنی جگہ اجتہاد کا درجہ رکھتی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم چوتھی صدی کے اس مفکر کے خیالات کو سامنے رکھ کر اسلامی نظام معیشت اور تقسیم دولت کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ دنیا دار علماء اور ملوکیت کے زرخرید سرمایہ دار کے حمایتی مولویوں کا محاسبہ کریں۔

ابو محمد فرماتے ہیں:۔

"اگر زکوٰۃ اور خراج کی آمدنی مسلم معاشرے کے حاجتمندوں کی احتیاج پوری نہ کر سکیں اور وہ کافی نہ ہوں تو امام یا حاکم اس معاشرہ کے مالداروں کو مجبور کر سکتا ہے کہ وہ حاجتمندوں کی احتیاج پوری کریں ابو محمد نے احتیاج اصلیہ کی وضاحت اس طرح کی ہے وہ فرماتے ہیں

ہو گئی کہ وہ ملازمین کے مطالبات تسلیم کرے اور انتظامی کارروائی کے طور پر دی جانے والی سزائیں واپس لے اور یونین سے نیا معاہدہ کرے۔

انتظامیہ نے یہ مطالبہ مان لیا کہ مہنگائی الاؤنس کو بنیادی تنخواہ میں شامل کیا جائے۔ بنیادی تنخواہ میں مہنگائی الاؤنس شامل کرنے کے بعد مجموعی تنخواہ پر دس فیصد اضافہ کیا جائے۔ نئے اسکیل کا نفاذ یکم دسمبر ۱۹۶۴ء سے ہوگا۔ بقایا جات یکم جولائی ۱۹۶۴ء سے ادا کئے جائیں گے۔ تنخواہ میں اضافے کے نتیجے میں الاؤنسوں میں جو اضافہ ہوگا وہ یکم جون ۱۹۶۴ء سے ادا کیا جائیگا

اس کامیابی نے ان ملازمین کی بھی آنکھیں کھول دی ہیں جو اب تک یونین سے بے تعلق تھے۔ اب وہ بھی یونین میں شامل ہو گئے ہیں اور یونین کی طاقت میں مزید اضافہ ہوا ہے۔

حسین ٹیکسٹائل ملز میں "روزہ افطار ہڑتال"

کراچی۔ (نامہ نگار منشور) حسین ٹیکسٹائل ملز میں روزہ کھولنے کے لئے کوئی چھٹی نہیں دی جاتی تھی جب کہ علاقے کے بیشتر ملز باقاعدہ ۱۵ منٹ کی چھٹی اپنے مزدوروں کو دیتے ہیں۔ مگر مزدوروں نے ۱۳ رمضان کو ٹھیک چھ بجے تمام کھاتے بند کر دیئے اور سب کینٹین میں جمع ہو گئے اور روزہ کھولنے کے بعد خود بخود اپنے اپنے کام پر واپس چلے گئے۔ اس صورت حال سے منتظمین بے حد پریشان ہیں لیکن مزدور کے اتحاد کے آگے مجبور بھی ہیں۔

فیڈریشن آف بنک ایمپلائز یونینز

کی جنرل کونسل کے پہلے سالانہ اجلاس کی روداد

ابو
بیان کی کراچی ۱۹ جنوری ۱۹۶۵ء (نمائندہ منشور) کراچی کے (مخفی مبادا) ان کی تعداد ان کے لیڈروں کے دعوے کے ہدی سے ایک دس ہزار ہے۔ لیکن ان محنت کشوں کو "فرمایا لئے عملی کام بہت کم کیا گیا ہے مزدوروں معلوم ہوتے کو یکجا کرنے کے لئے آخری کوشش نے مالداروں ـشن آف بنک ایمپلائز یونین کی شکل ناداروں اور کے ۱۳ بنکوں کی ٹریڈ یونینز پر مشتمل سعید بن منصور اس سے اور یونائیٹڈ بنک کے ملازمین اس ہیں۔ نکہ ان دونوں بڑے بنکوں کے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا نام تک مفقود ہے۔ اللہ تعالٰے نے مالدار کا پہلا سالانہ اجلاس نیشنل بنک اس قدر مال لازماً حتایل بولٹن مارکیٹ پر ۱۹ ار ہے جو اس جماعت ـ ہوا سیکریٹری جنرل کی کفالت کر سکے۔ اگر اس سیکریٹری جنرل اخلاق حسین نادار ننگے بھوکے ہوں یا کاروائی پڑھ کر سنائی تنگی میں مبتلا ہوں۔ تو یہ بار

اس کے بعد انھوں نے سالانہ رپورٹ کا خاکہ پیش کیا اور بتایا کہ اسکی نقول حاصل کرنے کے بعد رپورٹ میں ترمیم و تنسیخ کی جاسکتی ہے اس کے بعد آصف صدیقی نے اپنی صدارتی تقریر میں فیڈریشن کے کارناموں پر روشنی ڈالی اور فنڈز کی قلت پر افسوس کا اظہار کیا۔ مسلم کمرشل بنک اسٹاف یونین کے سیکریٹری جنرل احسن یوسف صاحب نے کہا کہ اپنی کارکردگی کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی بجائے ہمیں اپنی کوتاہیوں پر بھی نظر ڈالنی چاہیئے تاکہ انکی اصلاح کیجا سکے انھوں نے انڈسٹریل ڈویلپمنٹ بنک آف پاکستان اسٹاف یونین کے جنرل سیکریٹری کی برطرفی کے مسئلہ کو فیڈریشن کی کمزوری قرار دیا اور کہا کہ یہ ہمارے وقار کا مسئلہ ہے۔ درانی صاحب کو بحال کرانے کے لئے ہمیں کسی قربانی حتیٰ کہ ہڑتال تک سے گریز نہ کرنا چاہیئے درانی صاحب نے احسن یوسف کی تائید کرتے ہوئے

خبرنامہ

ہڑتال کو اشد ضروری قرار دیا اس مسئلہ پر ایک پر زور قرارداد منظور کرنے کے بعد فیصلہ ہوا کہ اگر مسئلہ جلد حل نہ ہوا تو فیڈریشن کی جانب سے ہڑتال کا نوٹس دیدیا جائے۔ اسٹیٹ بنک آف انڈیا ایمپلائز یونین کے جنرل سیکریٹری اکرام حسین اعظمی صاحب نے اپنی انتظامیہ پر فروری ۶۴ء کے معاہدہ کی خلاف ورزی کا الزام عائد کیا چنانچہ فیصلہ ہوا کہ سالانہ انتخابات کے بعد اس مسئلہ کو حل کرانے کی کوشش کی جائے۔

سالانہ انتخابات کے لئے انتخابی کمیشن کے چیرمین کے لئے مسلم کمرشل بنک آسٹاف یونین کے صدر ملک ضیاء الحق صاحب اور نیشنل اینڈ گرنڈلیز بینک ایمپلائمز یونین کے شاہ سعید الحق صاحب میں مقابلہ ہوا۔ موخرالذکر کو ۹ کے مقابلے میں ۱۳ ووٹوں سے کامیابی ہوئی۔ انتخابات کرانے کے لئے ۱۲ فروری ۶۵ء کی تاریخ مقرر کی گئی۔

آصف صدیقی صاحب نے اسمبلیوں میں محنت کشوں کی نمائندگی کے لئے قرارداد پیش کی جو اشرف حسین صاحب کی ترمیم کے ساتھ بعد بسیار بحث و مباحثہ منظور کر لی گئی۔ محنت کشوں میں پھوٹ ڈالنے کے لئے علاقائی عصبیت پھیلانے اور حالیہ فسادات کو فرقہ وارانہ رنگ دینے کی شازش کی مذمت کے لئے اشرف حسین صاحب کی قرارداد منظور کی گئی۔

افطار کے بعد جب اجلاس دوبارہ شروع ہوا تو سالانہ حسابات کے بارے میں۔ استفسار کیا گیا۔ اخلاق حسین صاحب نے سکریٹری جنرل اور خزانچی کی غیر حاضری کی وجہ سے حسابات پیش نہ کئے جا سکنے پر افسوس کا اظہار کیا اور ذمہ داری لی کہ انتخابی اجلاس سالانہ رپورٹ کے ساتھ پیش کر دیئے جائیں گے۔

محمد امین عرف جی این شیخ اور امیر فیصل درانی صاحبان نے بھی تقریریں کیں جن میں حبیب بنک اور یونائیٹڈ بنک میں یونین قائم کرنے کے مسئلہ پر زور دیا گیا اور سندھ ریجنل کوآپریٹو بنک میں یونین کے قیام کو کوآپریٹو بنکوں کے محنت کشوں کے لئے فال نیک قرار دیا گیا ہے۔

ناطقہ سر بہ گریباں

"لیبر پارٹی" بنانے کی ترکیب

——— حاضرین اور فنڈز جمع کرنے کا طریقہ

سیاسی جماعتیں دو تین آدمیوں پر چلتی ہیں

کراچی (نمائندہ منشور) نئے سال کی اہم خبروں میں سے ایک خبر یہ ہے کہ چند مخیر اور اہل دل حضرات نے پاکستان کے مزدوروں اور متوسط طبقے کو فائدہ پہنچانے کے لئے ان کی ایک نمائندہ سیاسی تنظیم بنانے کا منصوبہ مکمل کر لیا ہے اور اس کا نام "لیبر پارٹی" تجویز کر لیا گیا ہے۔

یہ انکشافات نیشنل اینڈ گرینڈلیز بینک ایمپلائمز یونین اور فیڈریشن آف بنک ایمپلائمز یونین کے صدر جناب آصف صدیقی صاحب نے فیڈریشن کی جنرل کونسل کے اجلاس منعقدہ ۱۹ جنوری ۶۵ء میں کئے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اب موقع آگیا ہے کہ ٹریڈ یونین کارکن ملک کے سیاست کو اپنے ہاتھ میں لیں۔ اور یہ کوئی ناممکن یا مشکل بات نہیں ہے کیونکہ ٹریڈ یونین کارکن آسانی کے ساتھ اپنی ایک علیحدہ سیاسی جماعت بنا سکتے ہیں۔ اور یہ جماعت پاکستان کی سب سے طاقتور سیاسی جماعت بن سکتی ہے۔

آصف صاحب نے پاکستان لیبر پارٹی کے قیام پر زور دیتے ہوئے کہا کہ کسی سیاسی جماعت کو چلانے کے لئے زیادہ افراد کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ صرف چند دانشور اور مفکر اس کے کرتا دھرتا ہوتے ہیں اور انھیں کی رائے پر جماعت کام کرتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس وقت ملک میں جتنی بھی سیاسی جماعتیں ہیں سب کی سب ناکارہ ہیں۔ اور اسی لئے لیبر پارٹی کا قیام ضروری ہے۔

مجوزہ لیبر پارٹی کے پہلے جلسۂ عام کو کامیاب بنانے کے لئے انہوں نے اپنے نادر منصوبے کا بھی اعلان کیا انہوں نے کہا کہ وہ انجمن اتحاد پختون کے ایک ذمہ دار عہدہ دار سے اس معاملے میں بات چیت مکمل کر چکے ہیں۔ مذکورہ عہدیدار لیبر پارٹی میں بہت دلچسپی لے رہے ہیں۔ اور بڑی مسرت کے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ وہ اس جلسے کو کامیاب بنانے کے لئے اپنے تمام اراکین کو جن کی تعداد سات لاکھ ہے پندرہ روپئے فی ٹرک کے حساب سے جلسہ گاہ میں پہنچا دیں گے۔ آصف صاحب نے کہا کہ اگر ہم ٹریڈ یونین کارکن بھی کوشش کریں تو تقریباً چار لاکھ مہاجر، بنگالی۔ پنجابی اکھٹے کر سکتے ہیں۔ اس طرح یہ جلسۂ عام پاکستان کی تاریخ کا سب سے بڑا جلسۂ عام ہوگا۔ آصف صاحب نے کہا کہ اس طرح جلسہ کر کے ہم مختلف علاقوں کے لوگوں کو قریب لانے اور ان میں اتحاد پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کریں گے اور یہ ایک ایسا کارنامہ ہوگا۔ جو نہ تو کنونشن انجام دے سکتی ہے۔ نہ متحدہ حزب اختلاف۔ فیڈریشن کی جنرل کونسل کا دوسرا اجلاس افطار کے بعد شروع ہوا تو جناب آصف صدیقی صاحب نے دوبارہ لیبر پارٹی کے قیام کے منصوبے پر تقریر شروع کی حاضرین نے پوری توجہ سے اس عظیم الشان منصوبے کی تفصیلات سنیں۔ ایک صاحب اس حد تک متاثر ہوئے کہ انہوں نے فوری سوال پوچھا کہ اتنے بڑے جلسے اور تنظیم کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا۔؟

جناب آصف صدیقی صاحب نے جواب دیا کہ ہمیں ہماری ضرورت سے بھی زیادہ رقم خود سرمایہ دار مہیا کریں گے۔ ٹریڈ یونین کارکن کی حیثیت سے ہم جانتے ہیں کہ سرمایہ داروں میں آپس میں اختلاف ہوتا ہے۔ چونکہ ہمارے پاس ووٹرز کی بہت بڑی تعداد ہو گی اس لئے ہم سرمایہ داروں کے اس آپس کے اختلاف سے فائدہ اٹھائیں گے۔ ہم اس سرمایہ دار سے بھی روپیہ لیں گے جو خود کامیاب ہونا یا کسی کو کامیاب کرانا چاہتا ہو اور اس سرمایہ دار سے بھی جو انھیں ناکام بنانا چاہتا ہو۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہ رضاکارانہ پیش کش کی کہ وہ اپنے وسائل سے کام لے کر پورے ملک میں پارٹی کی شاخیں قائم کریں گے۔ منصوبہ اتنا مکمل اور جامع تھا کہ شاید اس پر فوری عمل شروع ہو جاتا لیکن کونسل کے ایک کم سمجھ ممبر نے فیڈریشن کے حسابات کا سوال اٹھایا اور اس طرح بات دوسری طرف نکل گئی! افسوس کہ لیبر پارٹی زندہ باد کا نعرہ تک نہ لگ سکا۔

آرچی فاراوپل لیبارٹریز ایمپلائز یونین انتظامیہ کی دھاندھلیوں کے خلاف عدالت سے رجوع کریگی

انصاف کا مطالبہ؛ تخریبی عناصر کی مذمت

کراچی (نامہ نگار منشور) آرچی فاراوپل لیبارٹریز ایمپلائز یونین نے اپنے ایک مراسلے میں منتظمین فیکٹری سے مطالبہ کیا ہے کہ مزدوروں اور منتظمین کے درمیان جو معاہدہ ۲۹ دسمبر ۱۹۶۴ء کو ہوا تھا اس پر جلد از جلد عمل درآمد شروع کیا جائے اور اگر موجودہ خلاف ورزی جاری رکھی گئی تو مزدور اس کے لئے مجبور ہوں گے کہ وہ عدالت سے انصاف طلب کریں یہ مراسلہ یونین کے سکریٹری نے ۱۳ جنوری کو تحریر کیا ہے جس میں اس بات پر شدید احتجاج کیا گیا ہے کہ بونس چھٹی۔ طبی امداد، کنونس الاؤنس، پراویڈنٹ فنڈ کے سلسلہ میں کئے ہوئے معاہدہ کی منتظمین کھلی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ جس میں مزدوروں میں شدید ہیجان اور بے چینی پھیلتی جا رہی ہے۔ نیز اسی مراسلہ میں کینٹین کے انتظام اور خواتین ورکرس کو زچگی کے دوران چھٹی نہ دینے پر بھی شدید احتجاج کیا گیا۔ مراسلہ میں یونین نے صاف طریقہ پر یہ کہا ہے کہ اب مزدور منتظمین کی اس مزدور دشمن پالیسی کو زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکتے۔

ہمارے نمائندے کو معلوم ہوا ہے کہ آرچی فاراوپل لیبارٹریز لانڈھی میں یونین بنتے ہی منتظمین نے یونین کے سرکردہ ورکرس کے خلاف روایتی ہتھکنڈے استعمال کرنا شروع کر دیئے ہیں۔ کئی ورکرس کو ذمہ دار افسران دھمکیاں بھی دے رہے ہیں کہ اگر وہ یونین میں شامل رہے تو ان کی ملازمت خطرہ میں پڑ جائے گی۔ یاد رہے مذکورہ معاہدہ کی خلاف ورزی کے سلسلہ میں گزشتہ دنوں ایک ہڑتال بھی فیکٹری میں ہو چکی ہے۔ یونین کی مجلس عاملہ نے اپنے اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعہ منتظمین سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ خوشگوار صنعتی تعلقات کی بقا اور صنعتی امن کے لئے مزدوروں کو تنگ کرنے کے بجائے ان کے مسائل سمجھنے کی کوشش کرے۔ ایک اور قرارداد میں آرچی فاراوپل لیبارٹریز ایمپلائز یونین نے گزشتہ دنوں کراچی میں ہونے والے فسادات کی شدید مذمت کی ہے۔ اور مطالبہ کیا ہے کہ ان کی آزادانہ عدالتی تحقیقات کرائی جائے اور تمام مزدور برادران سے اپیل کی ہے وہ مفاد پرست متعصب عناصر سے ہوشیار رہیں اور اپنے اپنے علاقوں میں بھائی چارہ سے مل جل کر اپنے مسائل پر جدوجہد کرنے کی کوشش کریں مجلس عاملہ نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ چند مفاد پرست تخریبی عناصر کے غلط نعرے سے مزدور اتحاد کو مجروح کرنے کا باعث ہوتے ہیں اور امید ظاہر کی ہے کہ مزدور ملک اور قوم کے وسیع تر مفاد کے پیش نظر اپنے مثالی اتحاد کو برقرار رکھیں گے

الیکٹرک ایمپلائز یونین پشاور کے مطالبات

پشاور ۲۲ جنوری۔ پشاور ریجن کی مجلس عاملہ نے ایک قرارداد کے ذریعے مغربی پاکستان واپڈا سے مطالبہ کیا ہے کہ چونکہ محکمہ بجلی کے کمرشل آفس میں مجوزہ مشین سسٹم رائج کرنے سے اس علاقہ میں بے روزگاری بڑھنے کا احتمال ہے لہٰذا یونین مذکور بنیادی طور پر اس طریق کار کی مخالفت کرتی ہے جو لاہور میں بھی نہ صرف عوام کے لئے بلکہ خود اتھارٹی کے لئے بھی پریشانی کا باعث ثابت ہو چکا ہے۔ مجلس عاملہ نے جس کا ہنگامی اجلاس میر شاہ زمان صدر یونین کی زیر صدارت ہوا۔ ایک قرارداد منظور کی کہ اتھارٹی نے بعض وجوہات کی بنا پر کمرشل آف پشاور میں مشین سسٹم جاری کرنے کا ارادہ کر لیا ہے تو کمرشل ڈویژن اور کرنٹ چک پارٹیوں کے عملے کے مندرجہ ذیل حقوق کی وضاحت کی جائے (۱) مشین سسٹم رائج کرنے کے بعد موجودہ عملے میں تخفیف نہیں کی جائے گی اور نہ کسی ملازم کے موجودہ عہدے میں کمی کی جائے گی۔ (۲) مشین سسٹم پر تعیناتی موجودہ عملے کی سنیارٹی پر کی جائے گی۔ (۳) مشین سسٹم پر عملے کی تعیناتی کے سلسلے میں جو غیر اصولی امتحان لیا گیا ہے اسے منسوخ کیا جائے مجلس عاملہ نے دوسری قرارداد میں مغربی پاکستان واپڈا کے اعلیٰ حکام کی توجہ مصالحتی اجلاس کی طرف مبذول کرائی جس میں یونین نے اتھارٹی کے معزز ممبران یقین دہانی پر مجوزہ ہڑتال کا نوٹس واپس لے کر امن صلح دوستی اور رواداری کا ثبوت دیا تھا۔ قرارداد میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ مصالحتی اجلاس میں طے شدہ امور پر فوری توجہ دے کر ممبران یونین کی بے چینی کو دور کیا جائے اور یونین مذکور کی بنیادی امن دوست پالیسی کو برقرار رکھنے میں مدد کی جائے قرارداد میں مغربی پاکستان واپڈا کے چیرمین جناب غلام اسحاق خاں سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ یونین کے دیرینہ اور جائز مطالبات پر ذاتی طور پر توجہ دے کر ممبران یونین کو حق دلا کر شکریہ کا موقع دیں۔

گیس اینڈ الیکٹرک اپلائنسز ورکرز یونین نے اپنے مطالبات کے لئے ہڑتال کا نوٹس دے دیا!

کراچی۔ (نمائندہ منشور) گیس اینڈ الیکٹرک اپلائنسز کو قائم ہوئے تقریباً ڈھائی سال ہو چکے ہیں۔ اس فیکٹری میں کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد سو سے زائد ہے اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود ابھی تک مزدوروں کو وہ سہولتیں بھی مہیا نہیں کی جاتیں جو اسٹینڈنگ آرڈر کی رو سے انتظامیہ کی ذمہ داری ہے۔ اب تک ملازمین کو صرف دس روز کی سالانہ چھٹی ملتی رہی ہے۔ اس کے علاوہ نہ تو کچھ حقوق ہیں نہ ہی چھٹیاں۔ ان حالات سے مجبور ہو کر مزدوروں نے اپنی یونین بنانے اور حقوق حاصل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس مقصد کے لئے مزدوروں کا ایک جلسہ ٹریڈ یونین آفس ولایت آباد میں ۱۶ جنوری کو منعقد ہوا۔ جس میں عبدالسلیم کو صدر۔ نسیم الدین اور اصغر کو نائب صدر۔ محمد شفیع کھٹی کو جنرل سکریٹری اور واحد بشیر کو مشیر قانونی منتخب کیا گیا جلسے کے فیصلے کے مطابق رجسٹریشن کے لئے کاغذات داخل کئے جا چکے ہیں۔

مزدوروں کا دوسرا جلسۂ عام عبدالسلیم کی صدارت میں ۲۲ جنوری ۱۹۶۵ء کو ٹریڈ یونین آفس میں منعقد ہوا جس میں عبدالسلیم۔ نسیم الدین۔ محمد شفیع کھٹی۔ فہیم الدین اور واحد بشیر کو ہڑتال کا نوٹس دینے کے لئے نمائندہ چنا گیا۔ ہڑتال کا یہ نوٹس بھی دیا جا چکا ہے۔ اس میں سالانہ چھٹیوں میں اضافہ۔ بیماری اور اتفاقی چھٹیاں بغیر تنخواہ چھٹی۔ ۱۹۶۳ء، ۱۹۶۴ء کا بونس۔ سب لاؤنس اور دیگر مطالبات شامل ہیں۔

یونین کے منتخب صدر عبدالسلیم نے نمائندہ منشور کو بتایا کہ مزدور کافی عرصے تک خاموشی سے ظلم برداشت کرتے رہے ہیں۔ اور اب انہوں نے اپنے حقوق حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم ہمیشہ پر امن طور پر گفت و شنید کے ذریعے معاملات طے کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور توقع ظاہر کی کہ اگر مالکان اور محکمۂ محنت نے انصاف پسندی کا ثبوت دیا تو صنعتی امن کے قیام میں بڑی مدد ملے گی۔

ٹرسٹ سرامک انڈسٹریز

انتظامیہ کی دھاندلیوں کی وجہ سے پریشان کن حالات

محکمۂ محنت کی لاپرواہیوں کی وجہ سے مزدوروں کے حقوق کی پامالی

کراچی۔ (نامہ نگار منشور) ٹرسٹ سرامک انڈسٹریز لانڈھی کے حالات روزبروز مخدوش ہوتے جارہے ہیں اس لئے کہ اس فیکٹری کی انتظامیہ نہ تو عدالت کے فیصلوں کا احترام کرتی ہے اور نہ ہی قوانین کی کوئی پابندی اپنے اوپر جائز سمجھتی ہے۔ گزشتہ دنوں مغربی پاکستان صنعتی عدالت کراچی میں جن ۱۲ افراد کو بحال کیا تھا وہ ابھی تک صحیح معنوں میں کام پر واپس نہیں لیے گئے یہ تمام افراد یونین کے عہدے دار ہیں اور روزآنہ فیکٹری کمپاؤنڈ میں ڈیوٹی کے اوقات باہر بیٹھے رہتے ہیں ان سے نہ تو کوئی کام لیا جاتا ہے اور نہ ہی دوسرے ورکرس سے انھیں ملنے کی اجازت ہے۔ اس کے باوجود تنخواہ ہر مہینے دے دی جاتی ہے۔ یونین کے ایک عہدیدار اور سرگرم کارکن مسٹر عبدالحق کا معاملہ بھی شاید اپنی نوعیت کا واحد معاملہ ہے۔ مسٹر عبدالحق کو چھ ماہ قبل غیر قانونی طور پہ برطرف کردیا گیا تھا۔ فیکٹری انسپکٹر مسٹر میاں معراج الدین نے ان کی برطرفی غیر قانونی بھی قرار دے دی تھی لیکن ابھی تک نہ تو انھیں واپس ڈیوٹی پر لیا گیا اور نہ ہی فیکٹری انسپکٹر نے "سٹینڈنگ آرڈرز" کی خلاف ورزی میں منتظمین کا چالان کیا ہے۔ حالانکہ "پیمنیٹ آف ویجز ایکٹ" کی عدالت میں مقدمہ دائر ہوتے ہی مسٹر عبدالحق کے تمام واجبات ادا کردیئے ہیں لیکن منتظمین ابھی تک انھیں واپس ڈیوٹی لینے کے لئے تیار نہیں۔ چند افسران نے ان کی بحالی کے مسئلہ کو اپنے ذاتی وقار کا مسئلہ بنالیا ہے۔ ٹرسٹ سرامک انڈسٹریز یونین کے ایک نمائندہ نے بتایا کہ فیکٹری کھلے طور پر مزدوروں کو "سنگل اوور ٹائم" ادا کیا جاتا ہے مگر ابھی تک محکمۂ محنت کی طرف سے ان کا ایک چالان بھی نہیں کیا گیا حالانکہ اس سلسلہ میں کئی مرتبہ تحریری اور زبانی طور پر شکایت کی جاچکی ہے۔ دوسری طرف بونس کے معاملہ میں بھی ورکرس میں کافی بے چینی پائی جاتی ہے لیکن ابھی تک منتظمین نے اس سلسلہ میں کوئی اقدام نہیں کیا ہے۔

اسٹیٹ بنک آف انڈیا

انتظامیہ کی معاہدہ کی خلاف ورزی

نمائندہ منشور سے ایک ملاقات میں اسٹیٹ بنک آف انڈیا اسٹاف یونین کے جنرل سیکریٹری مسٹر آئی ایچ اعظمی نے بتایا کہ بنک کی انتظامیہ مسلسل معاہدہ کی خلاف ورزی کررہی ہے یہ معاہدہ ۲۱ فروری ۶۴ء کو ہوا تھا اس کی ایک اہم شرط ہاؤس بلڈنگ الاؤنس ہے جو ابھی تک پوری نہیں کی گئی ہے فروری ۶۴ء کے بعد سے یونین نے اس سلسلہ میں بار بار یاددہانی کرائی ہے دسمبر ۶۴ء میں یونین نے اس سلسلے میں زبردست احتجاجی مہم چلائی لیکن اب تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ جسکی وجہ سے ملازمین میں زبردست غم و غصہ پایا جاتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ منتظمین نے ایک ایسے شخص کو جسے یونین کے مفاد کے خلاف کام کرنے کی وجہ سے یونین سے نکال دیا گیا ہے غیر قانونی طور پر اور یونین کے ساتھ کئے ہوئے معاہدوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ترقی دے کر سب اکاؤنٹنٹ بنادیا ہے۔

جناب اعظمی صاحب نے بتایا کہ ان تمام امور پر گفتگو کرنے کے لئے انھوں نے ۱۹ جنوری ۶۵ء کو منیجر پاکستان برانچز سے ملاقات کی اور انھیں واضح طور پر بتلادیا کہ ملازمین مزید تاخیر برداشت نہیں کریں گے اگر ملازمین کے دو مطالبات یعنی ہاؤس بلڈنگ ایڈوانس فوری طور پر نہ دیا گیا اور یونین کے خلاف سازشیں بند نہ کی گئیں تو یونین سخت اور موثر قدم اٹھانے پر مجبور ہوگی۔

الیکٹرانک انڈسٹریز میں یونین کا قیام

بہتر حالات کار کے لئے جدوجہد کا قیام

(کراچی نمائندہ منشور) الیکٹرونک انڈسٹریز ایک پرانا کارخانہ ہے جس میں مرفی ریڈیو اسمبل ہوتے ہیں اس کارخانے میں زیادہ تعداد ایسے مزدوروں کی ہے جو آٹھ آٹھ سال سے کام کررہے ہیں لیکن انھیں آج تک سوائے سالانہ چھٹی کے اور کوئی سہولت فراہم نہیں کی گئی اس صورت حال کو ناقابل برداشت پاکر مزدوروں نے الیکٹرونک انڈسٹریز ورکرز یونین کے نام سے اپنی یونین بنانے کا فیصلہ کیا ہے یہ فیصلہ ٹریڈ یونین آفس ولایت آباد میں منعقدہ مزدوروں کے ایک جلسۂ عام میں کیا گیا جلسہ میں کئی مزدوروں نے تقریریں کیں اور کارخانے میں ہونے والی زیادتیوں کی تفصیلات بیان کیں ان کے علاوہ اجلاس سے چاچا علی جان اور واحد بشیر نے بھی خطاب کیا اور یونین کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی جلسے نے اقبال احمد کو یونین کا صدر۔ حسن عباس کو جنرل سیکریٹری اور واحد بشیر کو مشیر قانونی منتخب کیا۔ ان کے علاوہ عظیم اللہ نائب صدر۔ حیدر خاں جوائنٹ سیکریٹری۔ عبدالغنی پروپیگنڈہ سیکریٹری حبیب الرحمٰن خزانچی۔ محفوظ علی۔ محمد نذیر محمد رفیع۔ بدرالدین اور عبدالعلیم ممبران مجلس عاملہ منتخب ہوئے۔ جلسے کے فیصلے کے مطابق رجسٹریشن کے لئے کاغذات داخل کردیئے گئے تھے جس کی بنا پر لیبر آفیسر معراج دین صاحب نے رجسٹر وغیرہ منگوا کر جانچ پڑتال مکمل کرلی ہے توقع ہے کہ جلد ہی رجسٹریشن مل جائے گا۔



گرگ باراں دیدہ

مزدوروں کا بدترین دشمن — چرچل

لندن ۲۷ جنوری (اے پ) ناٹنگھم شائر میں بیلسٹن کی ٹاؤن کونسل نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ سرونسٹن چرچل کو خراج عقیدت نہ پیش کیا جائے۔

ٹاؤن کونسل کے ایک ممبر نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ میں چرچل کو کان کنوں کا دشمن نمبر ایک سمجھتا ہوں وہ نہ صرف کان کنوں کے بلکہ سارے مزدوروں کے بدترین دشمن تھے۔ ایک دوسرے کونسلر نے اُن سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ اس کے باوجود میں اس لئے مسٹر چرچل کو خراج تحسین پیش کروں گا کہ اگر سرونسٹن چرچل نہ ہوتے تو یہ ملک نازیوں کے قبضہ میں ہوتا کونسل نے بہرحال یہ طے کیا کہ اس کی طرف سے مسٹر چرچل کو کوئی خراجِ عقیدت نہ پیش کیا جائے۔





مصنف: شارد جوشی
مترجم: جلیل اشرف

محافظ

ڈھلوان گلی کے ختم ہوتے ہی چھوٹا سا چوراہا ہے جہاں کانتی ماں مونگ پھلی کی دکان کرتی ہے۔ پاس ہی ایک پان والا ہے۔ ادھر ایک بھانڈ، بازو ہٹ کر ایک بینڈ ماسٹر اور پاس ہی ایک پن چکی آواز کرتی ہے۔ کانتی ماں کو اس گلی میں رہتے اور کونے میں بھنی ہوئی مونگ پھلی بیچتے برسوں ہو گئے۔ آسرا ایک بیٹی بسنتی کا ہے۔ جو پانچ گھروں میں برتن مانجھ کر چالیس پچاس کما لیتی ہے۔ گیہواں رنگ، لمبی ناک، چھوٹی چھوٹی تیرتی آنکھیں

کانتی ماں اس پر کڑی نظر رکھتی ہے۔ کیونکہ جوان چمڑی کون جانے کس کا ہاتھ پھسل جائے۔

دوپہر کا وقت بلاجے والے کے یہاں سے پائپ کی آواز گونجنے کے سوائے سب جگہ خاموشی تھی۔ رام لال جو وہیں پر مل میں منشی گیری کا کام کرتا تھا ایکا ایک بسنتی کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ اسے جانتی تھی۔ پیچھے کے باڑے میں رہتا تھا اور سویرے جب وہ نل پر پانی بھرنے جاتی تب خاص کر وہ بھی بالٹی ہلانے آجاتا تھا۔

بسنتی نے اسے دیکھا پر دھیان نہیں دیا ایکا ایک وہ پاس آگیا اور بولا۔ "بائی پانی پلا دو"

بسنتی اندر گئی لوٹا بھر لائی دہلیز پر بیٹھ کر اس نے ایک ہاتھ میں لوٹا لے چلو سے پانی پیا اور "بس" کہتا ہوا گیلے ہاتھ مونچھوں پر پھیرتا ہوا آگے بڑھا۔

"اور تو نہیں چاہیئے۔؟" بسنتی نے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ ٹوپی سنبھالتا ہوا چل دیا اور بسنتی گھر میں گئی۔

ممبولی کو پکتے اور چھوکری کو جوان ہوتے دیر نہیں لگتی۔ بسنتی اس محلہ میں بڑی ہوئی اور یہاں کے سارے بوڑھے اور ادھیڑ عورتوں مردوں سے ماما، کاکی جیسے ناطے جوڑ رکھے ہیں۔ بچپن میں کئی بار محلے ٹوڑے کے سامنے بسنتی پٹی ہوگی پر اب وہ دیکھتے دیکھتے جوان ہو گئی ہے تو اسے نگرانی میں رکھنا اور بیاہ کر شوہر تک پہنچانا۔ یہ صرف کانسی ماں کی ہی فکر نہیں بلکہ سارا محلہ اسے اپنا فرض سمجھتا ہے۔

ان دنوں کانسی ماں گیا گئی تھی۔ بھائی کے لڑکے کی شادی میں جانا ضروری تھا اور دوسری امید تھی کہ بسنتی کے لیے کوئی اچھا سا لڑکا بھی تلاش کرے گی ماہ بھر کا کام بیٹی کو ساتھ نہیں لے گئی کیونکہ جن گھروں میں بسنتی برتن صاف کرتی تھی وہ سب چھوٹ جاتے اور یونہی پچاس روپے سے ہاتھ دھونا پڑتا۔ بسنتی یہاں اکیلی تھی۔

رام لال گلی کے باہر پہنچا ہوگا اور وہ اندر لوٹا مانجھ رہی تھی کہ دروازے پر سمترا نے قدم رکھا۔

"کیوں ری یہ کون تھا۔؟"

"کون۔؟" بسنتی نے پوچھا۔

"اری جو ابھی پانی پی کر گیا ہے؟"

"اچھی طرح تو نہیں معلوم۔ رام لال یا رام پرشاد۔ ایسا ہی کچھ نام ہے۔ پیچھے کے باڑے میں رہتا ہے۔"

"تو کیسے جانتی ہے اسے۔"

"میں نہیں جانتی؟ وہ نل پر پانی بھرنے آتا ہے۔ سو جانتا ہے مجھے۔ کہنے لگا بائی پانی پلا دو۔ تو میں نے پلا دیا۔"

"ہوں، میں نے پلا دیا۔ اری یہ سب تیری جوانی دیکھ کر منڈلاتے ہیں۔ تو نے ذرا آنکھ ڈھیلی کی اور ان کا کام بنا۔" سمترا نے کہا۔

"مجھ سے تو کچھ نہیں بولا۔"

"شروع میں تو رنگ بھانپنے آتے ہیں۔ اکیلا دیکھ کر ہاتھ پکڑ لیتے ہیں۔ ہوشیار رہنا۔"

بسنتی نے منہ پچکایا۔ "میرا ہاتھ پکڑیں گے تو گلا دبا دونگی۔"

سمترا مسکرائی اور دری پر بیٹھ گئی۔

"بخت (وقت) کہکہ نہیں آتا بیٹا۔ آج کے جمانے (زمانے) شگے بھائی کا وشواس نہیں کر سکتے۔"

"کیا ہوا؟ —" سکھ دیو نے ایک ہاتھ میں حقہ لے کر گھر میں گردن ڈالی — وہ ماچس کی تلاش میں بسنتی کے گھر آیا تھا۔

"آؤ —!" بسنتی بولی — "دوا (دادا) رام رام"

"سمترا نے جواب دیا —" ارے کچھ نہیں جی، رام لال کون ہے، جانتے ہو؟ وہ جو ابھی یہاں سے پانی پی کر گیا"

"نہیں جانتا تو نہیں، پر شکل سے بڑا غنڈا لگتا ہے —" سکھ دیو چوکھٹ پر بیٹھ گیا۔

"جوان چھوکری دیکھی تو دہلیز چڑھ گیا۔ ابھی پانی پی کر یہاں سے گیا ہے"

"اب آئے تو دھتکار دینا، نہیں مجھے خبر کرنا، میں سالے کی ہڈی بوٹی ایک کر دونگا"

"اونہہ۔ مجھے کچھ کرے گا تو کیا میں چھوڑونگی اسے" بسنتی بولی۔

"ارے! تو سمجھتی نہیں بیٹی، اور پانچ دوست کو ساتھ لائے گا تو تو اکیلی جان کیا کر سکتی ہے"

"موقع بے موقع جوان چوکری، کچھ ہو جائے تو کانسی ماں تو ہمارا نام لے گی نا" سمترا نے کہا۔ وہ آجائے تو ہماری ذمہ داری ختم"

"ہوں!—" سمترا بکھرتا سے سوچنے لگی۔

"تم دوپہر کو کیا کرتے ہو؟ اپنا حقہ اور رامائن لے کر یہیں پڑے رہا کرو"

"پر شام تو میں چوکیداری پر جاؤنگا"

"تب میں یہاں سو رہوں گی۔ گرمی کے دن ہیں او طلے پر سولوں گی۔ بسنتی گرمی کی وجہ سے دروازہ کھلا رکھ کر سوتی ہے۔ رات برات کوئی گھس آئے۔ جوان چوکری دنیا جانتی ہے"

"ٹھیک ہے ہمارا کیا۔ یہیں پر پڑے رہیں گے ماہ بھر میں تو کانسی ماں آہی جائے گی"

اس دن سے سکھ دیو دوپہر کو وہیں پر رہنے لگا۔ اور رات کو سمترا آ کر سو جاتی۔ سکھ دیو کی عمر ادھیڑ تھی۔ کالا رنگ اور چہرے پر چیچک چھاؤنی کے پارسی صاحب کے بنگلے پر چوکیدار تھا۔ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ ہاتھ سے سینک کر کھالیتا تھا۔ سمترا محلے کی جانی پہچانی عورت تھی۔ بیوہ ہوئے چار برس ہو گئے تیس پینتیس کی عمر ہوگی۔ دوکان سے سامان اٹھا کر گھر گھر پہنچانا اناج چننا اور پسوانا ایسے کچھ چھوٹے موٹے کام کر گزارہ کرتی تھی اکیلی جان نہ کوئی بال نہ بچہ۔

روز شام جب سکھ دیو چوکیداری پر جاتا تب گھر کے کام کاج سے نبٹتی سمترا اے اسکی تھوڑی دیر بات چیت اور ہنسی مذاق ہو جاتی۔

"کانسی ماں ابھی تک نہیں لوٹیں —؟"

"کارڈ لفافہ بھی نہیں آیا کچھ؟"

"آجائیگی، بسنتی کے لئے ور کھوج کر ہی آئے گی"

یہ سن کر بسنتی کچھ ناراض سی ہو جاتی۔

"ہاں جی! ہاتھ پیلے ہو تو چھٹی ہوئے۔ کسی کا گھر سنبھالے جا کر۔ سمترا سکھ دیو کی بات پر زور سے ہنس دی

"رام لال تو نہیں نکلتا اب؟" — سکھ دیو پوچھتا۔

"ارے اب نکلے گا تو ٹانگ توڑ دونگی اسکی —"

سمترا جواب دیتی۔ سکھ دیو اٹھتا اور سیڑھی کی طرف بڑھتا۔

"تم جا رہے ہو!—" وہ پوچھتی۔

"ہاں جاؤں!— لٹھ (لاٹھی) لے کر سکھ دیو چل دیتا۔ کچھ دیر اسے جاتا دیکھنے کے بعد سمترا ٹھنڈی سانس لیکر کہتی —" اکیلا ہے بیچارا"

"اور کیا مست رام۔ اپنے رامائن پڑھا کرے" بسنتی ٹوک لگاتی۔

اس روز دس کے اوپر ہو گئے تھے۔ سمترا سامان لے کر چھاؤنی میں اسی صاحب کے گھر ڈالنے گئی جہاں سکھ دیو چوکیدار تھا۔ صاحب چلے گئے تھے گھر میں صرف سکھ دیو تھا جو باہر باغ کی کیاریوں میں پانی ڈال رہا تھا۔

"آؤ جی! آؤ!!" — سمترا کو دیکھ کر اس نے جھاڑ زمین پر رکھ دیا۔

"یہ سنبھالو سکر، دال، گھاس لیٹ"

"اندر رکھ دو، آجاؤ۔ صاحب تو نہیں ہیں —" دروازہ کھولتے ہوئے سکھ دیو بولا۔

پیچھے کچن میں سکھ دیو نے سارا سامان رکھوا دیا۔ اور سمترا وہیں تھک کر بیٹھ گئی۔

"گھر نہیں گئے اب تک"

"مالی چھٹی پر ہے، تو صاحب بولے سکھ دیو پانی ڈال دینا باغ میں۔ وہی ڈال رہا تھا"

"میں تو بالکل تھک گئی۔ تین جگہ سامان رکھا"

"تھوڑی بیٹھ جاؤ۔ بدن ٹوٹ رہا ہوگا"

"پیاس لگی ہے پانی پلاؤ گے"

سکھ دیو اٹھا۔ صاحب کے ریفری جریٹر سے بوتل نکالی لوٹے میں ٹھنڈا پانی ڈالا اور شکر گھول کر لے آیا۔ ایک گھونٹ پی کر سمترا مسکرائی۔

"یہ کیا شربت بنا لائے"

"پی لو چپ چاپ"

وہ غٹ غٹ پی گئی۔

"واہ جی۔ یہاں آئے تو میٹھا پانی پینے کو ملا"

"ہمارے پاس تو میٹھا ہی میٹھا ہے۔ پینے والا چاہیئے —" سکھ دیو نے سانس چھوڑ کر ایسا کہا کہ سمترا لجا گئی۔

"اچھا اب چلوں —!" وہ اٹھنے لگی۔

"بیٹھو نا۔ کام ہی کیا ہے۔ ہم بھی تو بیٹھے ہیں"

"ہوں۔ روٹی بنانی ہے"

"میری تو بھوک ہی بھاگ گئی سمترا تجھے دیکھ کر" وہ منہ دیکھنے لگی۔

"سمترا دیکھو اس عمر کا خیال کرو۔ یونہی کیا مر مر کر دن بتاؤ گی؟ ابھی تو سکھ لینے کے دن ہیں"

"ہمارے بھاگ میں سکھ کہاں ہے"

"کیسی باتیں کرتے ہو۔ دیکھو میری رائے ہے کہ گھر بسالو"

وہ چپ رہی۔

"بولو نا ہمیشہ ایک سے دو اچھے ہوتے ہیں"

"مجھے تو انکار نہیں"

"اور نہیں تو کچھ دن اور کاٹنا ہے۔ پھر تو رام نام جپنے کے دن آجائیں گے"

"کیوں جی کچھ بولو —!"

"لوگ کیا کہینگے۔ اس عمر میں . . . . ."

"اری چھوڑو! کہیں گے تو مٹھائی ہی کھائیں گے۔ ایک سے دو بھلے۔ گھر بسا کر بیٹھ گئے۔ کیا بری بات ہے اسمیں"

تین چار دن میں محلے کے لوگوں نے تعجب سے دیکھا کہ رام لال کی برچھا آنکھ کے لئے ڈھال کی طرح بنے سمترا اور سکھ دیو بسنتی کے دروازے پر پہرا دینا بند کر۔ ایک گھر میں آ گئے۔ سکھ دیو سے مسخری کی تو پیڑا کھانے کو ملا۔ بسنتی من ہی من میں ہنستی تھی۔ رکھوالوں کے جیون میں ایر پھیر دیکھ کر۔

اسی دن جب رام لال ٹوپی سنبھالتا ہوا نکلا تب بسنتی باہر کھڑی تھی۔ رام لال نے آنکھیں گڑا کر اسکی طرف دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔

تین گھر دور سکھ دیو کے دروازے پر بیٹھی سمترا دال چن رہی تھی۔ اس نے دیکھ لیا۔

"دیکھا جی تم نے یہ آ رہا ہے موا"

"کون —؟" سکھ دیو باہر نکلا۔

"رام لال ہے!—" وہ گھس پھسائی۔

"سکھ دیو دیکھتا رہا۔ اور رام لال سینہ تانے نکل گیا —

"غنڈا ہے پکا!" — وہ بولا۔

"بدمعاش!" — وہ بولی —" اور بسنتی کو دیکھو باہر کھڑی ہے"

"بات ہوئی کیا دونوں میں —؟"

"نہیں اسے دیکھتا چلا گیا"

بسنتی پیلی ساڑی پہنے کھمبے سے ٹکی کھڑی تھی سر کھلا تھا اور گلابی چہرہ مطلب سے بھرا ہوا تھا۔

"بسنتی —!" — سکھ دیو دہلیز سے چلایا" یہ بدمعاش جب ادھر آئے تو تم گھر چلی جایا کرو سمجھی؟"

"ہاں سکھ دیو کاکا" اس نے جواب دیدیا۔

"مر کیوں نہیں ڈھکتی۔ دو چار دنوں میں کانسی ماں آئے گی تو شکایت کرونگی"

"ہاں سمترا کاکی"۔ بسنتی نے جواب دیا۔

جب وہ دونوں اندر گئے تو سمترا نے دھیرے سے کہا" کاکا کاکی کہکر مسخری کرتی ہے چڑیل"

"ہاں —" سکھ دیو نے مسکرا دیا۔ نئی جوڑی کو شروع میں سب چھیڑتے ہیں"

سمترا اشرما گئی۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭



رقاصہ

مجسمہ ساز

افسر نقوی

عکس و تصور



شام ہوئی گھر چلے

عکاس

اصطفےٰ صدیقی

ہدایت کار عابدی　　　　(قسط نمبر ۲)

متحرک فلموں کی تاریخ

اس مسئلہ پر جن موجدوں نے کام کیا ان میں سے ایک ٹامس ایڈیسن تھے وہ فونوگراف ایجاد کر چکے تھے۔ اور اس کی مدد سے انہوں نے عوام کے استعمال کیلئے وہ مشین بنائی تھی جس میں سکہ ڈال کر گانا سنا جا سکتا ہے۔ جو بڑی منفعت بخش ثابت ہوئی انہوں نے اپنی غنائی مشینوں کو متحرک تصویروں سے آراستہ کرنیکی کوشش کی لیکن ان کی ابتدائی کوششیں ناکام ہو گئیں۔ پھر شاید ۱۸۸۹ء میں جارج ایسٹمین نے سیلولائیڈ کی لچکدار فلم بنانی شروع کی (ویسے سیلولائیڈ کی ایجاد کا سہرا جان ویزلے ہیاٹ کے سر ہے) اور تصویریں اتارنے کے لئے شیشے کی پلیٹ کی جگہ سیلولائیڈ کا استعمال "نیو جرسی" کے ایک شخص کی جدتِ طبع کا نتیجہ تھا۔

متحرک فلموں کی تصویر کشی کا اچھی حالت کا کیمرہ سب سے پہلے ایڈیسن نے ۱۸۹۱ء میں پیٹنٹ کرایا۔ ابتدا میں انہوں نے کینٹوسکوپ کی طرح ایک مشین بنائی جس پر پچاس فٹ لمبی فلم دکھائی جا سکتی تھی۔ تماش بین اس مشین میں بنے ہوئے ایک چھوٹے سے سوراخ سے کوئی تیرہ سیکنڈ تک کسی رقاصہ کو ناچتے یا کسی سرکس کے اداکار کو کرتب دکھاتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ اسی سال کئی کینٹوسکوپ مشین بیرونی ملکوں میں کافی شہرت پا چکی تھیں۔ یعنی دنیا سب سے پہلے متحرک تصاویر کی ترقی کے لئے بڑی اہم ثابت ہوئی۔ اور دنیا والے پہلی بار انسانی تصاویر کو حرکت کرتے دیکھ کر دنگ رہ گئے۔

دنیا کا سب سے پہلا نگار خانہ (اسٹوڈیو)

ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں تھا جس کا نام "بلیک میریا" تھا جس کے اندرونی جانب کولتار کی تہہ چڑھی ہوئی تھی۔ یہ جھونپڑی دراصل ایڈیسن کی تجربہ گاہ بھی تھی متحرک فلموں کے اس پہلے نگار خانے کا اسٹیج گھومنے والا تھا تاکہ اس پر سورج کی روشنی پڑتی رہے چونکہ ایجاد کردہ اس کیمرے کا وزن تقریباً ایک ٹن تھا اس لئے تمام متحرک تصویریں یہیں لی جاتی تھیں۔ سیٹ کی جس گوشے میں فلمبندی ہوتی اس کی اوپری چھت ہٹالی جاتی تاکہ سورج کی روشنی پورے سیٹ کو منور کر دے۔ ۱۸۹۵ء میں فرانس کے لومیئر برادران نے ایک ایسا کیمرہ ایجاد کیا جو باآسانی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا سکتا تھا۔ یہ ایک بڑی اس صنعت کی ترقی تھی۔ کیونکہ اسکی مدد سے نگار خانے سے دور بھی فلمبندی کی جا سکتی تھی بہ الفاظ دیگر فلمی صنعت اب بیرونی فلمبندی (آؤٹ ڈور شوٹنگ) کر سکتی تھی۔ ان ہی دنوں دنیا کے سائنس دان اس جانب نئے نئے کیمرہ ایجاد کرنیکی سعی کرنے لگے۔ بالآخر ۱۸۹۸ء میں ایسا کیمرہ بنا لیا گیا جس نے متحرک فلموں کو بند ڈبوں کی نمائش سے نکال کر پہلی بار ان کی نمائش موسیقی کے ایک حال میں کی گئی۔ اب ایڈیسن کے علاوہ دیگر لوگ بھی فلمیں بنانے لگے اور واقعاتی فلمیں مقبول ہوتی گئیں اور انہیں بیش قیمت تاریخی ریکارڈ کی حیثیت حاصل ہوتی گئی۔ یہ فلمیں ورائٹی پروگرام کے فوراً بعد "اختتامیہ" کے طور پر استعمال کی جاتی تھیں تاکہ تماشبین تھیٹر سے باہر چلے جائیں اور اگلے شو کیلئے دوسروں کے واسطے جگہ خالی کر دیں کیونکہ لوگ ان مختصر اور غیر مربوط فلموں سے جلد ہی تنگ آ جاتے تھے۔ اگر پیرس میں ایک تھیٹر کے ایک شعبدہ باز "جارج میلیز" نہ ہوتے تو ان فلموں متحرک کا بھی وہی حشر ہوتا جو بہت سی نئی نئی چیزوں کا ہوا تھا اور لوگ جلد ہی اس ایجاد سے اکتا جاتے مگر "میلیز" نے ان فلموں میں ایسے امکانات دیکھ لئے تھے جن سے وہ تھیٹر میں کام لے سکتے تھے انہوں نے فوٹو گرافی میں متعدد باریکیوں کو ترقی دی اور طرح طرح کی ترکیبیں ایجاد کیں۔ لیکن فلموں کی بقا میں ان کا سب سے زیادہ اہم حصہ "بیانیہ" تکنیک کو رواج دینا تھا۔ ۱۹ء میں انہوں نے بیس متحرک لیکن خاموش مناظر کی مدد سے "سنڈریلا" کی کہانی بیان کی تھی یعنی یہ فلمی دنیا کی سب سے پہلی منظر نامہ پر تیار ہونے والی فلم تھی اس کے بعد انہوں نے ایک دو اسی طرح کی فلمیں بنائیں جو کامیابی سے ہمکنار ہوئیں میلیز کی فلموں کی کامیابی کی وجہ سے ایڈیسن کے کیمرہ مین ایڈون ایس پورٹر نے یہ جدت پیدا کی کہ وہ نہ صرف کہانی بیان کرے بلکہ اس میں سنسنی پیدا کرتا۔

اس طرح انہوں نے عوام کے سامنے ایک نئی چیز پیش کی اور دلچسپی میں اضافہ کیا اس نے یہ بات دریافت کی کہ وہ فلم کی قطع برید (ایڈیٹ) کرکے اور پھر اسے یکجا کرکے مسلسل عمل کی فلمبندی کے مقابلے میں زیادہ بہتر قسم کی کہانی تخلیق کر سکتا ہے۔ اس طرح ایڈون ایس۔ پورٹر فلمی دنیا کا پہلا "مدوین کار" تھا۔ ان کی پہلی فلم غالباً "دی لائف آف این امریکن فائرمین" تھی جس نے کافی مقبولیت حاصل کی اسکے بعد انہوں نے کئی ہیجان انگیز فلمیں بنائیں۔ ان کی ایک فلم "دی گریٹ ٹرین رابری" کی نمائش ۱۹۰۵ء میں ایک تاریک گودام میں کی گئی جسے بعد میں سینما ہاؤس کی شکل دیدی گئی جو غالباً دنیا میں متحرک فلموں کا پہلا مستقل سینما تھا۔ ابتدائی فلمیں صرف ایک ریل کی ہوا کرتی تھیں کیونکہ فلمیں بنانے والوں کو شبہ تھا کہ کوئی شخص اس قسم کی تفریح کو چودہ منٹ سے زائد نہ پسند کرے گا۔ اس کے بعد دو ریل کی فلمیں بننے لگیں۔ فرانس اور اٹلی میں سب سے پہلے زیادہ طویل فلمیں بنائی گئیں۔ ۱۹۱۲ء میں فلمساز "ایڈلف زوکار" جو آگے چل کر "پیراماؤنٹ پکچرز" کے صدر بنے چار ریل طویل ایک فرانسیسی فلم کوئین ایلیزبتھ" کے حقوق حاصل کئے۔ جس میں اس زمانے کی تھیٹر کی ہر دلعزیز اداکارہ سارہ برن ہارٹ" نے

کام کیا تھا۔ ابتدائی دنوں میں تھیٹر کے پیشہ ور اداکار فلموں کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے ایک نوعمر اداکار جو ایک مفلوک فوجی کرنل کا لڑکا تھا وہ "لارنس گریفیتھ" کے فرضی نام سے فلم لائن میں شامل ہوا۔ یہ لوگ "ڈیوڈ وارک گریفیتھ" کی اداکارانہ زندگی کا آغاز تھا۔ جن کے کارناموں نے فلمسازی میں انقلاب برپا کر دیا تھا۔

"گریفیتھ" نے دور سے مختلف زاویوں اور قریب سے لی جانے والی تصاویر میں یہ بند و بست کیا کہ کیمرہ اس کی جگہ کام سر انجام دے اہنوں نے فلیش کی بڑی روشنی کے اثرات و مناظر کی ترتیب کے بھی تجربے کئے اہنوں نے کہانی سے تعلق رکھنے والی چیزوں پستول۔ خط۔ بندوق۔ خنجر یا کوئی ایسی چیز جو ڈرامائی کیفیت اور مفہوم میں اضافہ کر سکے ان کے قریب سے تصویریں لینے (کلوز اپ) کے طریقے سے کام لیا۔ اہنوں نے اس فلم کو کاٹ اور جوڑ کر وقت اور جگہیں تبدیلیاں کیں پھر اہنوں نے ۱۹۱۵ء میں ایک ایسی فلم بنائی جسے فلمی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے جس کا نام "دی برتھ آف اے نیشن" تھا جو پورے بارہ ریل لمبی تھی۔ پہلی مکمل لمبائی کی فلم بنانے کا سہرا گریفیتھ کے سر ہے۔

اس زمانے میں اتنی طویل کوئی اور فلم بننے میں نہیں آئی تھی۔ یہ فلم تقریباً تین گھنٹے تک دکھائی جاتی تھی اور اس کے ساتھ ایک خصوصی نغمہ بھی تھا جسے ایک مکمل سمفنی آرکسٹرا نے پیش کیا تھا۔ اس سے قبل کبھی اس قسم کی کوئی فلم تیار نہیں ہوئی تھی۔ اس میں جنگل کے دور سے لئے جانے والے مناظر اور قریب سے لی جانے والی پورے پردے کی تصویریں تھیں اور پوری فلم ڈرامے... ہیجان اور تاثر سے بھرپور تھی اس میں جو زندگی اور جذبات پیش کئے گئے تھے وہ اس زمانے میں فلم بین حضرات کے لئے ایک ناقابل فراموش اور موثر تجربے کی حیثیت رکھتے تھے۔ گویا یہ پہلی فلم تھی جو جذبات پر روشنی کے ذریعہ تاریخ ضبط تحریر میں لائی گئی تھیں۔ اسی نے ثابت کر دیا کہ فلم میں جذبات پر اتنی اثر انداز ہو سکتی ہے۔ اس نے ایک معاشرتی قوت کی حیثیت سے متحرک فلموں کی طاقت اور عوام میں اس پسندیدگی کا مظاہرہ کر دیا۔

(باقی آئندہ)

انور حامد انجم لکھنوی

وابستۂ وجود ہے خوفِ عدم ابھی
ہر آشیاں کو دام سمجھتے ہیں ہم ابھی

اے اہلِ کارواں مری حالت بگڑ چلی
چلتے ہی چلتے رک گئے میرے قدم ابھی

امید و یاس فکرِ نشیمن کے ساتھ ہی
چنتے ہیں تنکے اور جلاتے ہیں ہم ابھی

کتنا حریصِ ذوقِ وفا نے بنا دیا
میرے لئے ہے دردِ دو عالم بھی کم ابھی

چاروں طرف سے بجلیاں پھر کوندنے لگیں
تنکے ہی چننے پائے تھے دو چار ہم ابھی!

لوگ کہتے ہیں



بھوپال

مکرمی تسلیم

سالنامہ مل چکا ہے۔ میں نے بڑی دلچسپی کے ساتھ اسے پڑھا۔ بہت سی نظم ونثر کی چیزیں پسند آئیں آپ کا افسانہ بہت اچھا ہے۔

سالنامے کے مضامین، افسانوں اور نظموں وغیرہ کی ترتیب میں آپ نے بڑا سلیقہ برتا ہے عباس صاحب والا انٹرویو بھی بہت اچھا ہے۔ ان کے کارنامے اور بھی اچھے ہیں۔ منشور یقیناً نکلتا رہے گا آپ لوگوں کی زندہ کوششوں سے میں یہی توقع کرسکتا ہوں۔

کوثر چاندپوری

راولپنڈی

محترم سلام ونیاز

یوں تو میں منشور کا باضابطہ مطالعہ کرتا ہوں۔ لیکن سالنامہ دیکھ کر جتنی خوشی ہوئی ہے اس کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔ شاید ہی ہندو پاک کے نامور ادباو شعراء کا اس قدر قلمی تعاون کسی اور پرچہ کو حاصل ہو۔ لیکن منشور واقعی اس قابل ہے کہ سب کو مطالعہ کرنا چاہیئے۔ نظمیں اور غزلیں خوب ہیں افسانوں کا بھی جواب نہیں۔ "چلو خرید لو" بہت اچھی ہے "معصوم تمنا" کیا ہی کہنا۔ نقاش کاظمی اور نا شی فاروقی کا کلام خوب ہے۔

صلیب ودار سجانے کا اہتمام کرو
جنوں کا جشن مناؤ خرد کا نام کرو

بہت سے معنی لئے ہوئے ہے۔ آپ نے نئے لکھنے والوں کو موقع دے کر نئی قدروں کو اجاگر کیا ہے۔

حیدر نقوی

کراچی

برادرم تسلیمات

عرصہ کے بعد آواز دے رہا ہوں۔ شاید آپ پہچان جائیں منشور کا سالنامہ دیکھا (سالگرہ مبارک ہو) بڑا پسند آیا۔ آپ نے اس خاص نمبر میں ترتیب میں جس محنت اور جانفشانی کا مظاہرہ کیا ہے وہ منشور کے صفحات پر روشن ہے۔

جوہر میر

سونی پت

مائی ڈیر۔ خلوص ونیاز

منشور کا سالنامہ ملا۔ سالنامہ انتہائی خوبصورت سادہ۔ معیاری اور ایک ادبی دستاویز ہے۔ ہندو پاک کے اچھے اچھے ادیبوں کا ہجوم دیکھ کر تمہاری لمبی لمبی باہوں کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ ویسے تو منشور میں تمام تخلیقات اچھی ہیں لیکن خصوصی طور پر پسند آنے والی تخلیقات کے نام لکھ رہا ہوں۔ اعتراف۔ کایا پلٹ۔ روح کی ساتھی۔ اداکار اجنبی شام۔ بے چاری منی اور گردش کارواں۔ حصہ نظم بھی کافی بھرپور ہے اس کامیاب اور حسین سالنامے پر مبارکباد قبول کرو۔ میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں کیونکہ تم نے نہایت غیر موافق حالات میں ایک ایسے کاز (CAUSE) کی حمایت کا عزم کیا ہے جسکو براہ راست بانزاور تمام دنیا کے محنت کشوں کی حمایت حاصل ہے۔ منشور کا ہر قدم کامیابی اور کامرانی کی جانب بڑھ رہا ہے یہ اسکی چالوں ہی سے بخوبی ظاہر ہے۔

ہربنس لال ساہنی

پشاور

مکرمی السلام علیکم

منشور کا سالنامہ آج ہی نظر نواز ہوا۔ شکریہ! آپکی محنت کی داد وہی لوگ خوب دے سکتے ہیں جو اس دار وگیر سے کبھی گذر رہے ہوں۔ مدیر کو رسالے کی شکل وصورت بنانے کے لئے ادبا و شعراء کا تعاون حاصل کرنے کے لئے جو پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں اس کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس دشت کی سیاحی کر چکے ہوں برچہ خوبصورت ہی نہیں معیاری بھی ہے اور ہندو پاک کے مشہور فنکاروں کی تخلیقات نے ایک لاجواب تحفہ بنادیا ہے۔ ترتیب بھی منشور کی ماہانہ اشاعتوں کی بہ نسبت کہیں بہتر ہے کیا اچھا ہو کہ آپ اس سائز کو ہی اپنالیں اور اسی ترتیب سے آپ اسے ہر ماہ شائع کیا کریں۔

تاج سعید

کراچی

بھائی صاحب السلام علیکم

سالنامہ ملا۔ پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی۔ اتنا اچھا اور اچھوتا نمبر نکالنے پر میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائیں

ہدایت کار عابدی

ردولی

محترمی تسلیم

سالنامہ ملا۔ پسند آیا۔ منشور بڑی برق رفتاری کے ساتھ ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ اس روز افزوں ترقی پر میری مبارکباد قبول کیجئے۔

اقبال ردولوی

پرانا سکھر

محترم آداب ونیاز

منشور کا سالنامہ پالیا۔ بہت خوب ہے۔ آپکی محنت کی داد دینا میرے نزدیک کور ذوقی کے سوا کچھ نہیں مبارکباد قبول فرمائیں۔

نکہت بریلوی

گورکھپور

بھائی صاحب تسلیم

مبارک باد قبول کیجئے۔ اتنا شاندار سالنامہ نکالا ہے آپ نے کہ جواب نہیں۔ ملتے ہی اس میں کھو گیا۔ تفصیل میں جاؤں تو صفحے کا صفحہ سیاہ ہو جائے مختصر یہ کہ ظاہری و معنوی ہر دو اعتبار سے کافی ٹھوس اور معیاری ہے۔ عصمت، کرشن چندر اور فیض و فراق کے ساتھ کتنے ہی چوٹی کے فنکار نظر آتے ہیں۔ سوچتا ہوں، بیک وقت ان سب کا تعاون آپکو کیسے مل گیا۔ سائز بھی پیارا ہے عام شماروں کا بھی یہی ہو تو بہتر ہے۔

ایم کوٹھیاوی راہی

کراچی

مکرمی السلام علیکم

منشور کا سالنامہ نظر نواز ہوا۔ بہت ہی پسند آیا تمام تخلیقات مختصر معیاری اور دلچسپ ہیں۔ اس میں لکھنے والے بھی بے حد مقبول اور شہرت یافتہ فنکار ہیں آپکی محنت رنگ لا رہی ہے۔ اس وقت منشور تمام ادبی اور سماجی پرچوں میں منفرد اور نمایاں حیثیت کا حامل نظر آتا ہے

اختر امین بجنوری

لکھنو

ڈیئر!

منشور کا سالنامہ بہت پسند آیا۔ اسکی تخلیقات کے بارے میں لوگ کہتے رہیں گے۔ مجھے اس میں شائع ہونے والی تصویروں کے بارے میں عرض کرنا ہے —— ایک فاضل نقاد کی تصویر دیکھ کر شبہ ہوا کہ انھوں نے غالباً وگ لگا کر تصویر کھنچوائی ہے ایک ممتاز ترین افسانہ نگار کی تصویر نے ان کلاسیکل تصویروں کی یاد تازہ کر دی جن میں لوگ ہاتھ میں گلدستہ اور چھڑی لے کر تصویر کھنچوایا کرتے تھے ایک عظیم شاعر نے اپنی جوانی کی تصویر آپکو بھیج دی ایک ممتاز ترین افسانہ نگار خاتون نے غالباً اپنی صاحبزادی کی تصویر پر اکتفا کیا۔ ایک راجہ صاحب کی تصویر سے ریاست کی بجائے ایکٹنگ ٹپک رہی ہے۔ ایڈیٹر کی تصویر میں فوٹو کم اور چربی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ اپنی تصویر اتنی اچھی نہیں جتنے ہم خود حسین ہیں۔ مسز ایڈیٹر کو دیکھ کر بڑا ترس آیا۔ غالباً اس سے زیادہ دبلی ہونگی۔ چہرے پر نقاہت کے کافی آثار ہیں اس کے علاوہ بہت سے دانش وروں کی تصویر دیکھ کر ان سے ملنے کی خواہش دل سے یک لخت رخصت ہو گئی اکثر فنکاروں کے بارے میں شبہ ہوتا ہے کہ روتے یا پٹتے میں انکی تصویر اتاری گئی ہے۔ ایک آدھ کے بارے میں تو یقین ہے کہ انھوں نے پڑھنے والوں کو ڈرانے کے لئے تصویر چھپوائی ہے۔ بہ حیثیت مجموعی کم ایسی تصویریں ہیں جن کا تصویر بتاں میں شمار کیا جا سکے۔ خوش شکل خواتین کی تصویروں کی کمی سالنامے میں بری طرح کھٹکتی ہے امید ہے آئندہ ادارہ اس کمی کو پورا کر دے گا۔

احمد جمال پاشا

جھنگ

محبی سلام

منشور کا سالنامہ افق ادب پر شروع رمضان ہی میں عید کا چاند بن کر چڑھا ہے۔ سارے کا سارا پرچہ موتیوں کا ہار ہے "آغاز سخن" سے لے کر تماشائی کے قلم تک جملہ مندرجات سالونے، بھالونے ہیں۔ آپ نے مضامین نظم و نثر کے ساتھ فنکاروں کے عکس مہیا کر کے لطف مطالعہ کو دو آتشہ کر دیا ہے۔ اس دو مزگی کے لئے قارئین آپ کے ممنون ہوں گے۔ جناب ممتاز حسین کا مقالہ داد طلب ہے مصور جلال اور انکی "جاگ سوزِ عشق جاگ" نے میرے روزے کو چار چاند لگا دیئے اور چار گڑیاں بھی تو نظر انداز نہیں کیجا سکتی۔ بھئی اتنا سستا اور اس قدر پیارا شمارا آپکے ایثار و کردار کی دلیل ہے۔ مبارکباد قبول فرمائیں۔ جنوں کی حکایات خونچکاں آپ ہی کا حصہ ہیں۔

شیرافضل جعفری

جیکب آباد

محبی ہدیۂ خلوص

منشور باقاعدہ مل رہا ہے۔ سالنامے کی ظاہری شکل و صورت بڑی خوبصورت ہے۔ اور آپ لوگوں کی جانفشانی قابل تحسین ہے۔ آپ لوگوں نے منشور کا سالنامہ نکال کر ان سرمایہ داروں کے منہ پر بھرپور تھپڑ رسید کیا ہے جو یہ سمجھتے تھے کہ منشور خود بخود ہی سسک سسک کر دم توڑ دیگا۔ آپ اور پی آئی اے یونین کے جیالے ساتھی جس انہماک اور شوق سے منشور کو حسن ترتیب عطا کر رہے ہیں اسکی داد میرے اور جیکب آباد کے مزدور ساتھیوں کی طرف سے قبول فرمایئے۔ منشور —— حق پرستی کا یہ پرچم —— اللہ تبارک و تعالیٰ اسے زندہ و تابندہ رکھے۔

ایس اے شمسی گوالیاری

کراچی

برادرم سلام

منشور پابندی سے مل رہا ہے۔ بارہا سوچا شکریہ کا خط لکھوں۔ مگر مصروفیات نے اجازت نہیں دی اب کی بار سالنامہ ملا تو اسے ظاہری و معنوی خوبیوں سے اس حد تک مزین پایا کہ شاید ہی کوئی رسالہ اسکی ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔ سابقہ شمارے لائق داد تھے۔ لیکن، سالنامہ لائق رشک ہے اور آپکی مساعی پر مبارکباد نہ دینا بد ذوقی۔

شفقت رضوی

بھوپال

مکرمی تسلیم

منشور کا سالنامہ دیکھا۔ مختلف مکتبۂ فکر کے مشاہیر ادب کو یکجا کر کے آپ نے کمال کر دکھایا ہے چمنستانِ منشور میں مہکتے ہوئے گلہائے رنگا رنگ سے دماغ و روح کو تازگی ملی۔ جو پھول جس جگہ ہے وہیں لاجواب ہے آپکی بے باکی، علم دوستی اور بلند عزائم کا قائل ہونا ہی پڑتا ہے۔ اتنا معیاری، دیدہ زیب اور فکر انگیز سالنامہ پیش کرنے پر مبارکباد قبول فرمائیے۔

مظفر رئیس

ہری پور

بھائی! مزاج گرامی !!

۱۷ر جنوری کو چونکہ اتوار تھا لہٰذا ہم لوگ ایبٹ آباد چلے گئے۔ رات کو گیارہ بجے جب واپس آئے اور کمرے میں داخل ہوئے تو کوئی چیز پاؤں سے ٹکرائی اور "سر" کی آواز پیدا ہوئی اور انجانا سا خوف ذہن پر مسلط ہو گیا کہ کیا ہو سکتا ہے۔ جلدی سے سوئچ پر ہاتھ گیا اور روشنی پھیلی تو "منشور" میرے سامنے پڑا تھا بڑھ کر اٹھایا اور بغیر کپڑے تبدیل کئے ہوئے ورق گردانی شروع کر دی اور فوراً خیال آیا کہ آپ انسان نہیں بلکہ کوئی اور مخلوق ہیں۔ اس لئے سالنامہ جس حسن و ترتیب کا ضامن ہے کسی اور کے بس کی بات نہیں اور اب سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے شروع کروں۔ کیا پڑھوں۔ واقعی بہت محنت کی ہے اور عالم صحافت کے باسیوں کو ایک درس دیا ہے۔ نظمیں۔ مضامین۔ افسانے کیا خوب ہیں اور آپنے تو ماشاءاللہ دنیائے ادب جدید کے تمام ستاروں کو یکجا کر دیا ہے۔ دو تین ماہ کے بعد منشور کی صورت دیکھنے میں آئی جس قدر تعریف ہو کم ہے اردو کی ترویج و ترقی کے لئے واقعی آپ جیسے نوجوانوں کی ضرورت ہے۔

نقاش کاظمی


بیٹری جو آپ کی گاڑی کو
رواں دواں رکھتی ہے۔
Exide
BATTERIES
گارنٹی
اکسائیڈ بیٹریاں عمدہ کوالٹی کی ہوتی ہیں اور سخت ترین آزمائش
کے بعد آپ تک پہنچتی ہیں۔ مندرجہ ذیل خوبیوں کی وجہ سے ساری دنیا میں مشہور ہیں۔
دیرپا
گاڑی فوراً اسٹارٹ ہوتی ہے
روشنی تیز ہوتی ہے
اور سارے ملک میں ان کی سروس کا معقول انتظام موجود ہے۔
اکسائیڈ بیٹریز آف پاکستان لمیٹڈ

REGD.NO. S - 2575

THE MONTHLY MANSHOOR KARACHI